ISSN 0974-7346

مارچ ۲۰۲۳ء
جلد ۲۱۰—عدد ۳

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

# سالانہ زر تعاون

| ہندوستان | سالانہ ۳۵۰؍روپے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپے۔<br>۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔<br>لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔ |
| --- | --- |
| دیگر ممالک | رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰؍روپے۔<br>ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔<br>اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔ |
| بذریعہ ایمیل | اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔ |

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

# معارف

جلد نمبر ۲۱۰ ماہ شعبان المعظم ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۲۳ء عدد ۳



دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

nfo@shibliacademy.org

## فہرست مضامین

# شذرات

گذشتہ دنوں ترکی کے جنوب اور شام کے شمال اور آس پاس کے علاقوں میں ایسا زلزلہ آیا جس نے انسانی جانوں کی ہلاکت اور آباد بستیوں کی بربادی اور تباہی کا وہ منظر دنیا کے سامنے پیش کر دیا جس کی مثال شاید ادھر کئی صدیوں میں نہ ملے۔ صرف پینتیس سکنڈوں میں ۴۰۶۴۲ لوگ ترکی میں اور ۵۸۰۰ لوگ شام میں جان بحق ہوئے اور صرف ترکی میں ۸۴ ہزار عمارتیں منہدم ہوئیں۔ دنیا والوں کے لیے صرف خبریں رہ گئیں اور شاید عبرت کی وہ داستانیں بھی جو نئی ہونے کے باوجود کبھی نئی نہیں کہی جائیں گی۔ انسانی تاریخ تو وقتاً فوقتاً خافضۃ رافعہ یعنی پست و بالا کر دینے والی حقیقت کا اظہار کرتی رہی ہے۔ قرآن مجید سے بڑھ کر انسانوں کی تاریخ کی سچائیوں کو اور کون بیان کر سکتا ہے۔ ولقد جاء ھم من الانباء مافیہ مزدجر (لوگوں کے پاس خبریں اتنی پہنچ چکی ہیں جن میں عبرت ہی ہے) عذابوں اور ان کے پردے میں قیامت سے پہلے انسانوں کو متنبہ کرنے کی ساعتوں کی کئی شکلوں کو بیان کیا گیا ہے، لیکن زلزلہ کی ساعت کو شئیٔ عظیم سے تعبیر کرنے میں یہی حقیقت ہے کہ زلزلے آتے ہیں تو قیامت صغریٰ بپا کر جاتے ہیں، قہرمان ہو یا حلب یا دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو، زمین کی تہوں کا الٹنا پلٹنا، پہاڑوں کا ٹوٹ کر بکھرنا، سمندروں کا جوش مارنا اور بڑی بڑی اور نہایت پختہ عمارتوں کا خاک اور راکھ کے ڈھیر میں بدل جانا اور انسانوں کے اپنے علم و فن کے ہر پُر قوت مظہر کا بے بس رہ جانا یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کا جواب انسانوں کی عقل کے پاس محض ظن و تخمینن کے علاوہ کچھ نہیں، حقیقت میں اس کی کوئی علمی توجیہ ہو ہی نہیں سکتی، جہاں بچنے والوں کو این المفر (جائے فرار کہاں) کہنے کی بھی مہلت نہ ملے اس حالت کو کس بات سے تعبیر کیا جائے۔ بس کسی صاحب دل کا یہی جملہ یاد آتا ہے کہ اس کو بخت واتفاق کے بے معنی لفظ کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر ہی نہیں کیا جا سکتا، جہاں صرف ایک حقیقت خود کو منوانے کے لیے سامنے رہ جاتی ہے کہ بس اللہ ہی ہے جس کی قدرت ہر شے پر محیط ہے۔ پینتیس سکنڈوں میں خدائے قادر و قدیر کا جلال ظاہر ہوا اور سب کچھ عدم محض اور ھباء منثورا میں بدل گیا۔ جو باقی رہ گیا وہ صرف سامان عبرت تھا، موجودہ زمانہ میں ذرائع ابلاغ کی ترقی نے وہ منظر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیے جو کبھی صرف کتابوں میں پڑھے جاتے تھے۔ ستر اسی ہزار انسانوں کے دلوں کی دھڑکن چشم زدن میں رکی تو دوسری طرف بچ جانے اور زندہ رہنے کی مہلت پانے والوں کے چہرے خود عبرت کا آئینہ بن گئے۔ شیر خوار ہوں یا بچے بوڑھے ہوں، ان کا بچ جانا اور کئی دنوں تک بھوکے پیاسے رہ کر بھی زندگی کی رمق سے محروم نہ ہونا دیکھا جائے تو یہی وہ انباء (خبریں) ہیں جن میں قدرت کے عجائبات، اس

کے آثار اور انسانی تاریخ کی آیات بینات دیکھی اور پڑھی جاسکتی ہیں۔ خبریں آتی جاتی ہیں کہ بڑے بڑے اور نہایت اہم اور تاریخ کو اپنی ثروت سے پر فخر بنانے والے آثار اس طرح زمیں بوس ہوئے کہ چشم فلک بھی ان پر اشک فشاں ہو گئی۔ انطاکیہ ہو یا حلب شام اس خطہ ارض نے انسانی تاریخ کے نشیب و فراز کو جتنا دیکھا اور اس کے مد و جزر کا سامنا کیا، شاید ہی دنیا کا کوئی اور خطہ اس معاملے میں ان کا ثانی ہو۔ لنریہ من آیتنا کا مفہوم اگر وسیع کیا جائے تو اشارہ، دلالت بن جائے گا کہ یہ زلزلہ بھی گویا آیات قادر مطلق میں شامل ہے۔ انسان کو اگر اپنی بے بسی اور بے چارگی پر نظر رکھنے کی توفیق ملے تو بربادیوں کے برکتوں سے بدلنے کے مناظر زیادہ دیر تک اوجھل نہیں رہ سکتے۔ بستیوں والے اگر اپنے آباد کرنے والے پر اعتماد و یقین رکھنے والے ہوں تو پھر آباد کرنے والے کا وعدہ ہے کہ ہم ان پر آسمان و زمین کی نعمتوں کے سارے در کھول دینے والے ہیں۔ لیکن جب قوانین فطرت کو مسخ کیا جائے تو فاخذنا ھم بما کانوا یکسبون (ہم نے ان کے کرتوتوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا) کے فطری عمل سے بچا بھی نہیں جاسکتا اور اس میں غلط اور صحیح کی نشان دہی بھی نہیں کی جاسکتی، بس ایک آواز رہ جاتی ہے جو باقی لوگوں کے لیے ایک صور بن کر سماعتوں کو پیغام دیتی ہے اور جواب لیے ہوئے یہ سوال بھی کرتی ہے کہ لمن الملک الیوم؟ للہ الواحد القہار۔ غلبہ واقتدار آج کس کے لیے ہے؟ ایک خدائے قہار ہی کے لیے۔

***

شعبان کا مہینہ شروع ہو چکا ہے اور ہلال رمضان کی دید اور اس کے شوق انتظار کو قریب سے قریب تر کرتا جاتا ہے۔ شہر رمضان کی بے شمار شناختوں میں اس کی صفت مواساۃ بھی ہے، وہ صبر کا مہینہ ہے، وہ جود و سخا کا زمانہ بھی ہے۔ ایسے میں زلزلہ کی قیامت سے گزرنے والوں کے لیے غم خواری اور جذبۂ اخوت کی عمل داری کا بہترین موقع ہے۔ جن پر مصیبت آئی ان کے لیے اور ان ہی کی طرح ان کے کام آنے والوں کے لیے اسی پیغام میں راحت و بشارت ہے کہ آزمائش کیسی بھی ہو، حقیقت میں خوف، بھوک اور مال و جان کے مصائب اور نقصانات میں یہی اقرار سرمایہ تسکین جسم و جاں ہے کہ ہم ہیں تو اللہ ہی کے۔ اسی کے پاس جانا ہے اور جانا کہاں؟

***

افسوس مولانا ابوالبیان عبدالرحمن حماد عمری بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ قریب سو سال کی عمر پائی۔ دارالسلام عمر آباد کی وادی علم و عرفاں جن سخن وروں سے آباد و شاد رہی، ان میں مرحوم کا نام نمایاں رہا، تحریر و تقریر دونوں میں خوب تھے، خصوصاً شاعری میں بڑی شہرت حاصل کی، پندرہ سولہ

سال کی عمر سے ذوق سخن کی آبیاری شروع کی، نثر میں کئی کتابیں آئیں، پھر حمد و نعت کا مجموعہ شائع ہوا۔ ملی و قومی نظموں کے مجموعہ کے علاوہ غزل گوئی میں انہوں نے فردوس تغزل جیسا دیوان پیش کیا۔ زبان اور فن دونوں طرح ان کی شاعری ارض جنوب کی اس روایت کا سلسلہ رہی جس پر شمال والوں کو رشک آتا رہا ہے۔ ان کی شاعری اصلاً قدیم اور صالح قدروں کی ترجمان تھی، غزل یا نظم کے کلاسیکی انداز کو انہوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس سفر کا حاصل یہ ہوا کہ:

حماد سے جن کو دوری تھی اب حال یہ ان کا دیکھا ہے
حماد کو پوچھا کرتے ہیں، حماد کو ڈھونڈا کرتے ہیں

یہ شعر بھی ان کی شخصیت کا ترجمان ہے کہ:

قلب مضطر چشم گریاں درد دل زخم جگر
کس قدر آلام ہیں یارب میری جاں کے لیے

جناب کلیم عاجز مرحوم کے بعد شاعری کو تقدس عطا کرنے والوں میں نظر جن پر جاتی تھی وہ ان میں سے ایک تھے۔ اللہ تعالی مغفرت فرمائے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق پروفیسر جناب ابن کنول کے انتقال نے بھی اردو دنیا کو سوگوار کردیا۔

***

گذشتہ شمارے میں بھٹکل کے ادارہ ادب اطفال کی جانب سے بچوں کی کتابوں کی نمائش اور کتابی میلہ کا ذکر اس لیے آیا تھا کہ اردو کی آئندہ نسل اور مستقبل کے اردو قاری کی تلاش کی فکر اب گویا نہیں کے برابر ہے۔ اردو کتابوں کی اشاعت اپنی جگہ لیکن آئندہ چالیس برس میں ان کی جگہ پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں ہوگی یا محض کتب خانوں میں وہ تماشا گاہ بن جائیں گی۔ بھٹکل میں نوجوانوں کے ذریعے اس فکر کی ہمت افزائی بدرجہ واجب ہے۔ اس موقع پر دہلی، بھوپال، لکھنؤ، حیدرآباد، بنگلور اور مالیگاؤں جیسے شہروں سے اردو کی فکر مند شخصیات جمع ہوئیں۔ پورے ملک سے قریب پچاس اہم ناشرین کتب شریک ہوئے۔ ایک ہفتہ کی نمائش میں ستر ہزار کی آبادی والے بھٹکل میں پینتالیس لاکھ کی کتابوں کی خرید و فروخت ہوئی۔ یقیناً ادارہ ادب اطفال کے نوجوان کارگزاروں کی شبانہ روز محنت اور ان کے اخلاص عمل کا یہ ثمرہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ملک میں اسی طرح اردو کی خدمت کی جائے۔

***

مقالات

# پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی مرحوم اور رجوع الی القرآن کی دعوت


**پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی**

zafarul.islam@gmail.com


نامور دانشور اور سابق ڈائرکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی کی وفات (۱۲؍نومبر ۲۰۲۲ء) پر اخبارات ورسائل میں شائع شدہ رپورٹوں و مضامین سے مرحوم کی حیات وخدمات کے مختلف پہلو سامنے آئے۔ان کی تعلیمی زندگی کا یہ پہلو بلاشبہ بڑا قیمتی اور سبق آموز ہے کہ انہوں نے جدید تعلیم کا سلسلہ درمیان میں چھوڑ کر محض اپنے شوق وطلب سے عربی زبان وادب اور اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی۔اس کے لیے انہوں نے درسگاہ اسلامی رام پور کا (خاص طور سے) جدید تعلیم گاہوں کے طلبہ کے لیے تشکیل کردہ قلیل المدتی چار سالہ کورس مکمل کیا اور قرآن کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح میں ماہر قرآنیات مولانا حمید الدین فراہیؒ (م: ۱۹۳۰ء) کے تلمیذِ رشید مولانا اختر احسن اصلاحیؒ (م:۹؍اکتوبر ۱۹۵۸ء) سے تقریباً چھ ماہ استفادہ کیا۔

واقعہ یہ کہ دینی علوم کے اکتساب کے لیے پروفیسر نجات اللہ صدیقی اور ان کے رفقاء (بالخصوص ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری رحمہا اللہ تعالیٰ) کی طلبِ صادق اور ارادہ کی پختگی تھی جس نے ان کے لیے راہیں ہموار کیں اور رام پور میں جماعت کے ذمہ داروں نے ''ثانوی درسگاہ'' کی صورت میں ان کی دینی تعلیم کا باقاعدہ نظم قایم کردیا۔جماعت اسلامی ہند کے اولین مرکز ملیح آباد میں جب دینی تعلیم کے نظم کے لیے انہوں نے جماعت کے ذمہ داروں کے سامنے اپنی طلب پیش کی تو انہوں نے وہاں وسائل کی کمی کی وجہ سے اس نظم سے معذوری ظاہر کی۔۱۹۴۹ء میں جب مرکزِ جماعت اسلامی رام پور منتقل ہوا اور جماعت کی افرادی قوت میں اضافے کے ساتھ یہاں وسائل بھی بڑھ گئے تو ان حضرات نے پھر جماعت کے ذمہ داروں سے اپنی طلب (جدید تعلیم یافتگان کے لیے دینی تعلیم کا خصوصی نظم) کا اعادہ کیا اور اس راہ میں اپنی کوشش جاری رکھیں۔

اس سلسلے میں اپنی کوششوں کے نتیجہ خیز مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں پروفیسر نجات اللہ صدیقیؒ فرماتے ہیں:

اور آخر میں ہم سے کہا گیا کہ آپ لوگ یہیں (رام پور میں) قیام کریں، آپ کی تعلیم کا نظم کیا جائے گا۔ چنانچہ میں نے اور حمید اللہ صاحب نے علی گڑھ کی تعلیم ترک کردی اور جنوری ۱۹۵۰ء سے وہیں قیام کیا اور چند ماہ بعد جب باقاعدہ ثانوی درس گاہ کا آغاز جولائی ۱۹۵۰ء میں ہوا تو (عبدالحق) انصاری صاحب بھی ندوہ سے اپنا تعلیمی سلسلہ مکمل کر کے رام پور آگئے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جماعت نے ثانوی درس گاہ کے قیام کا فیصلہ ہماری سچی طلب اور مستقل اصرار کے بعد کیا تھا[1]۔

دینی تعلیم کے اس مخصوص سلسلے کی تکمیل کے بعد پھر پروفیسر نجات اللہ صدیقی صاحب نے جدید تعلیم کے اعلیٰ مراحل (بی۔اے سے پی۔ایچ۔ڈی تک) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طے کیے۔ فروری ۱۹۷۷ء میں پروفیسر و ڈائرکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ کے منصب پر فائز ہونے سے قبل انہوں نے یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں تقریباً ۱۶ برس بحیثیت لکچرر و ریڈر تدریسی خدمات انجام دی تھیں۔

یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ موقر رسالہ ماہنامہ ترجمان القرآن (دسمبر ۲۰۲۲ء) میں ''یاد رفتگاں'' کے تحت میں پروفیسر نجات اللہ صدیقی مرحوم پر مدیرِ گرامی پروفیسر خورشید احمد کے مضمون میں یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علمی کے دوران جدید نظام تعلیم سے متعلق نامور مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی دو تحریروں کے مطالعہ نے ''نوعمر نجات اللہ کی زندگی کا دھارا بدل دیا اور انہیں زندگی بھر کے لیے تحریکِ اسلامی سے وابستہ کردیا''[2]۔ راقم کے خیال میں علی گڑھ کے فیوض و برکات کی طویل فہرست میں اسے بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ اضافہ بے موقع نہ ہوگا کہ ابھی چند ماہ قبل مولانا عتیق الرحمن سنبھلی پر ''الفرقان'' (لکھنؤ) کے خصوصی شمارے کے لیے مضمون لکھتے ہوئے اس راقم نے علی گڑھ سے اپنی فیض یابیوں کے ضمن میں یہ تاثر ظاہر کیا تھا:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جدید تعلیم کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے، لیکن اس علمی و تربیتی مرکز کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے بہت سے فیض یافتگان میں دینی علوم میں

---

[1] ڈاکٹر (عبدالحق) انصاریؒ کے دیرینہ رفیق ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی سے ایک انٹرویو، رفیقِ منزل (نئی دہلی) نومبر ۲۰۱۲ء، ص ۲۷

[2] پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مرحوم، ماہنامہ ترجمان القرآن، دسمبر ۲۰۲۲ء www.tarjumanulquran.org

دلچسپی بڑھانے، بالخصوص قرآن و علمِ قرآن سے تعلق مضبوط کرنے کا بھی وسیلہ بنتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس پہلو سے ادارۂ سرسید کا فیض پانے والوں میں یہ ناچیز بھی شامل ہے۔ یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے کہ اسی ادارے میں تعلیم حاصل کرتے اور بعد میں تدریسی خدمت انجام دیتے ہوئے اس ناچیز میں قرآنیات میں دلچسپی بڑھی اور اسی سرزمین میں قرآنی کتب کے مطالعہ کا ذوق وشوق پروان چڑھا[۳]۔

پروفیسر نجات اللہ صدیقی مرحوم بلاشبہ اسلامی معاشیات کے ایک ممتاز اسکالر تھے اور اس میدان میں ایک محقق و مصنف کے طور پر ہندوستان اور بیرونی ممالک میں بھی انہیں ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ اسلامی معاشیات کے موضوع پر اردو وانگریزی میں متعدد کتب ان کی علمی یادگاروں میں شامل ہیں۔ ان میں اردو کی کچھ مشہور تصانیف یہ ہیں: اسلام کا نظریۂ ملکیت، اسلام کا نظامِ محاصل (امام ابو یوسف کی معروف تصنیف ''کتاب الخراج'' کا اردو ترجمہ مع مبسوط حواشی)، شرکت و مضاربت کے شرعی اصول، غیر سودی بینک کاری، انشورنس اسلامی معیشت میں اور فقہِ اسلامی کے مسائل کی جدید تعبیر۔ اسرار شریعت کی وضاحت میں ان کی وقیع تصنیف ''مقاصدِ شریعت'' بھی بہت معروف ہے۔ ان سب کے علاوہ قرآن سے متعلق ان کی تحریریں (بالخصوص ان کے قرآنی مضامین کا مجموعہ ''رجوع الی القرآن اور دوسرے مضامین'') بڑی وقعت واہمیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقیؒ کی ایک اور قرآنی خدمت ''قرآن اور سائنس۔ افاداتِ سید قطب'' نامی کتاب ہے۔ یہ دراصل قرآن اور سائنس سے متعلق سید قطب شہید کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے اقتباسات کا اردو ترجمہ ہے جسے انہوں نے مولانا سلطان احمد اصلاحی مرحوم (م: ۲۹؍ مئی ۲۰۱۶ء) کے اشتراک سے انجام دیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کی کتابوں میں خاص طور سے ''اسلام کا نظریۂ ملکیت'' اور ''مقاصدِ شریعت'' میں قرآنی آیات کے بہت سے حوالے ملتے ہیں۔

زیرِ بحث موضوع کے اعتبار سے پروفیسر نجات اللہ صدیقیؒ کی کتاب ''رجوع الی القرآن اور دوسرے مضامین''، خصوصی ذکر کی مستحق ہے۔ القلم پبلیکیشنز (بارہ مولہ، کشمیر) سے ۲۰۱۵ء میں شائع شدہ اس مجموعۂ مضامین کی ہر تحریر رجوع الی القرآن کی دعوت دے رہی ہے اور قرآن حکیم میں تدبر و تفکر کے

---

[۳] الفرقان (اشاعتِ خاص)، ذکر عتیق بیادگارِ حضرت مولانا عتیق الرحمن سنبھلیؒ، ستمبر تا دسمبر ۲۰۲۲ء، ص ۵۹۔۶۰

بڑے قیمتی نتائج پیش کر رہی ہے۔اس کتاب کے مشتملات میں جو قرآنی نکات زیرِ بحث آئے ہیں ان میں خاص اہمیت کے حامل یہ ہیں: (۱) رجوع الی القرآن کی ضرورت واہمیت اور اس کے تقاضے، (۲) عصر حاضر میں قرآن کا پیغامِ رحمت عام کرنے اور قرآنی علوم کی اشاعت کے لئے جدید ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت، (۳) فہمِ قرآن میں ہدایاتِ ربّانی کے مقاصد کو سمجھنے کی افادیت، (۴) آیات کی تشریح وترجمانی میں شانِ نزول کی اہمیت و معنویت، (۵) ۹۱۱ء کے بعد مغرب میں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی بڑھتی ہوئی طلب اور مغربی زبانوں میں مزید مستند تراجمِ قرآن کی تیاری و اشاعت کے تقاضے، (۶) جدید تعلیم یافتگان اور عرب دنیا میں نامور مفسر مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے علمی کارناموں کے تعارف کی ضرورت وافادیت۔

بلاشبہ قرآن کریم سے رجوع کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے اور معاشرے کی موجودہ بگڑی ہوئی صورتِ حال میں اصلاحِ احوال کی خاطر عظیم ترین کتابِ ہدایت سے رجوع اور حصولِ رہنمائی کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔اس پس منظر میں مذکورہ بالا کتاب میں شامل پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقیؒ کی تحریر ''رجوع الی القرآن۔اہمیت اور تقاضے'' بڑی قدر و قیمت کی حامل ہے۔اس میں انہوں نے اس نکتے پر خاص زور دیا ہے کہ رجوع الی القرآن کی دعوت اب عام ہو چکی ہے، قرآن سمجھ کر پڑھنے کی طلب میں مزید اضافہ ہوا ہے، لیکن اس دعوت کے کچھ تقاضے ہیں، انہیں پورا کرنے پر خصوصی توجہ مطلوب ہے۔ بہتر ہوگا کہ قرآن کے پیغامِ رحمت کی ترسیل اور اس کی ہدایات کی تشریح وترجمانی کے لیے ایسی زبان، ایسا لہجہ اور ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جو جدید دور کے لوگوں میں فہم قرآن کے فروغ اور روزمرہ زندگی کے معاملات میں کتابِ ہدایت کے مطالبات کو سمجھنے و سمجھانے میں مفید اور موثر ثابت ہو۔

پروفیسر نجات اللہ صدیقی مرحوم کی رائے میں لوگوں کو رجوع الی القرآن کی دعوت دیتے ہوئے اُن رکاوٹوں پر توجہ دینے اور انہیں ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے جو عام لوگوں کو اس دعوت کو قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں درپیش ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی رکاوٹ زبان کی ہے، ہر شخص عربی زبان سے واقف نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی مادری زبان کو بھی کان سے سن کر سمجھ سکتی ہے، آنکھ سے دیکھ کر نہیں سمجھ سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ تر

مسلمان قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں[۴]۔ وہ پُر زور انداز میں اپنی اس رائے کو پیش کرتے ہیں کہ عام لوگ بھی قرآن کا ترجمہ پڑھ کر یا سن کر قرآن کی ہدایات و تعلیمات سے واقف ہو سکتے ہیں، اور وہ اس فکر کے داعی تھے کہ شروع ہی سے بچوں کو ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھانے یا قرآن کے معنی و مطالب سے باخبر کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس نکتے کی قدر و قیمت ذہن نشیں کرنے کے لیے انہوں نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مقدمہ فارسی ترجمۂ قرآن کے ایک اقتباس کی اردو ترجمانی ان الفاظ میں پیش کی ہے: ''یہ کتاب بچپن ہی میں پڑھا دینی چاہیے تاکہ سب سے پہلے ان کے ذہن میں جو چیز آئے وہ اللہ کی کتاب اور اس کے مطالب ہوں''[۵]۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بیان میں ''یہ کتاب'' سے مراد شاہ صاحب کا فارسی ترجمۂ قرآن ''فتح الرحمن بترجمۃ القرآن'' ہے، جیسا کہ اس کے مقدمے میں مذکور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصل الفاظ دلالت کر رہے ہیں، انہیں ملاحظہ فرمائیں:

> نامِ ایں کتاب فتح الرحمن بترجمۃ القرآن مقرر کردہ شد و نامِ مصنف ایں کتاب احمد ابن عبد الرحیم است و لقب مشہور ولی اللہ الدہلوی وطناً العمری نسباً احسن اللہ الیہِ و الیٰ مشایخہ و والدیہ۔ و مرتبہ ایں کتاب بعد خواندنِ متنِ قرآن و رسایلِ مختصر است تا فہمِ لسانِ فارسی بے تکلف دست دہد و بتخصیص صبیان اہلِ حِرف وسپاہیان کہ توقعِ استیفاءِ علومِ عربیہ ندارند در اوّل سنِ تمیّز ایں کتاب رابایشاں تعلیم باید کرد تا اوّل چیزی کہ در جوفِ ایشاں افتد معانیِ کتاب اللہ باشد و سلامتِ فطرت از دست نرود[۶]۔

اس فارسی اقتباس کے ضروری جزو کی اردو ترجمانی ممتاز عالمِ دین و سابق ناظم دارالمصنفین مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ (م: ۲؍فروری ۲۰۰۸ء) کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

> قرآن مجید کا متن اور فارسی کے مختصر رسائل پڑھنے کے بعد جب فارسی زبان بے تکلف سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جائے تو اس ترجمے کو شروع کرانا چاہیے خصوصاً سپاہیوں اور پیشہ ور لوگوں کے بچوں کے سنِ شعور کو پہنچنے کے ساتھ ہی اس کی تعلیم دینی چاہیے کیوں کہ ان سے یہ امید نہیں کہ وہ علوم

---

[۴] نجات اللہ صدیقی، رجوع الی القرآن اور دوسرے مضامین، القلم پبلیکیشنز، بارہ مولہ، کشمیر، ۲۰۱۵ء، ص ۵

[۵] رجوع الی القرآن اور دوسرے مضامین، محولہ بالا، ص ۶

[۶] شاہ ولی اللہ دہلوی، بترجمۃ القرآن، مخطوطہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ، مذہب، نمبر۔ ۷۰، ورق ۳ الف

عربیہ کی مکمل تحصیل کریں گے، تاکہ ان کے دلوں میں پہلی چیز جو جاگزیں ہو وہ کتاب اللہ کے معانی و مطالب ہوں، اس سے ان کی فطری سلامتی باقی رہے گی[۷]۔

یہاں یہ اضافہ بھی برمحل و مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحب زادے اور نامور اردو مترجم قرآن شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ''موضح قرآن'' کے مقدمے میں اپنے اردو ترجمۂ قرآن کو آسان زبان و عام فہم اسلوب میں پیش کرنے کی وہی غرض و غایت بیان کی ہے جو ان کے مرحوم والدِ محترم نے اپنے فارسی ترجمۂ قرآن (فتح الرحمن) کے مقدمہ میں واضح کی تھی۔ معارف (جنوری ۲۰۲۳ء) میں فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر محمد انس حسّان نے ''موضحِ قرآن'' کے مقدمہ کے حوالے سے شاہ عبدالقادر کا یہ بیان نقل کیا ہے:

> اس (اللہ) کے کلام میں جو ہدایت ہے دوسرے میں نہیں، پر کلام پاک اس کا عربی زبان میں ہے اور ہندوستانی کو اس کا ادراک محال ہے۔ اس واسطے اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ ابن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل اور آسان، اب ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے۔ الحمدللہ کہ سن ۱۲۰۵ھ میں میسر ہوا۔۔۔ اور اس کتاب کا نام ''موضحِ قرآن'' ہے۔ یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے ۱۲۰۵ھ[۸]۔

پروفیسر نجات اللہ صدیقی اس نکتے کی طرف خاص طور سے توجہ دلاتے تھے کہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، دین کی تعلیمات یا نصیحت و بھلائی کی باتیں قرآن کو سمجھ کر اس سے براہِ راست معلوم کی جائیں یا لوگوں کو بتائی جائیں تو وہ زیادہ اثرانداز ہوتی ہیں اور دل و دماغ میں اتر جاتی ہیں۔ اس نکتے سے متعلق ان کا بہت ہی واضح موقف یہ تھا کہ ''کوئی بات جب خدا کے حکم کے طور پر سامنے آتی ہے تو اس کا اثر کسی انسان کے وعظ و نصیحت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے''[۹]۔ اس ضمن میں انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ترجمۂ قرآن کے مقدمے کا دل میں نقش کر جانے والا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

---

[۷] ضیاء الدین اصلاحی، مقدمہ فتح الرحمن بترجمۃ القرآن کا تجزیاتی مطالعہ، ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ) جنوری۔ جون ۱۹۹۲ء، ص ۳۹۔۴۰

[۸] محمد انس حسان، شاہ عبدالقادر دہلوی کی قرآن فہمی، معارف جنوری ۲۰۲۳ء، ص ۹/ بحوالہ شاہ عبدالقادر، موضح قرآن (مقدمہ)، مطبع احمدی، کلکتہ، ۱۳۰۷ھ، ص ۱

[۹] رجوع الی القرآن اور دوسرے مضامین، ص ۷

سب کو معلوم ہے کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو سب چیزوں سے ناواقف اور محض انجان ہوتا ہے، پھر سکھلانے سے سب کچھ سیکھ لیتا ہے اور بتلانے سے ہر چیز جان لیتا ہے۔اسی طرح حق کا پہچاننا اور اس کی صفات اور احکام کا جاننا بھی بتلانے اور سکھلانے سے آتا ہے، لیکن جیسا حق تعالیٰ نے ان باتوں کو قرآن شریف میں خود بتلایا ہے ویسا کوئی نہیں بتلا سکتا اور جو اثر اور برکت اور ہدایت خدائے تعالیٰ کے کلام میں ہے وہ کسی کے کلام میں نہیں ہے،اس لیے عام وخاص جملہ اہلِ اسلام کو لازم ہے کہ اپنے اپنے درجے کے موافق کلام اللہ کے سمجھنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں"[۱]۔

رجوع الی القرآن کی دعوت دیتے ہوئے پروفیسر نجات اللہ صدیقی مرحوم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار بالخصوص ان کی تحریک رجوع الی القرآن"[۱۱] سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔وہ اس فکر کے داعی و مبلغ تھے کہ قرآن کے ترجمے کے ذریعہ عام پڑھے لکھے لوگ اسلام کے بنیادی عقائد، روزمرہ زندگی سے متعلق اہم ہدایات اور اخلاقی تعلیمات معلوم کر سکتے ہیں۔اور سمجھ سکتے ہیں،اس لئے (عربی زبان نہ جاننے کی صورت میں) قرآن کے تراجم سے استفادہ میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا عین مطلوب ہے۔اس ضمن میں انہوں نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ:

قرآن کے جن مطالب کو شاہ صاحب بچوں کے ذہن نشیں کرانا چاہتے تھے اور انہیں ان کے لئے قابلِ فہم سمجھتے تھے وہ مکارمِ اخلاق، آدابِ زندگی، عقائد توحید وآخرت ورسالت جیسے اصول ہیں، نہ کہ نکاح وطلاق اور وراثت کے قوانین یا جرم وسزا کے مباحث۔گمان کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ آج بھی عام لوگوں کو ترجمہ کے ذریعہ قرآن پڑھنے کے قابل نہیں سمجھتے ان کی نظر اول الذکر کی جگہ قرآن کے مشکل مباحث (یعنی فقہی مسائل اور ان کی تفصیلات) پر ہوگی"[۱۲]۔

واقعہ یہ کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آج سے تقریباً چار سو برس پہلے جو آواز بلند کی تھی اسے ایک انقلابی آواز کہا جاسکتا ہے۔اس پس منظر میں پروفیسر نجات اللہ صدیقی حیرت ظاہر کرتے ہیں آج اکیسویں صدی میں

---

[۱۰] ترجمۃ القرآن المجید / محمود الحسن، مع تفسیر شبیر احمد عثمانی، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ المنورۃ، ۱۴۰۹ھ، ص ۷

[۱۱] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوت رجوع الی القرآن پر تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ظفر الاسلام اصلاحی، شاہ ولی اللہ کی تحریک رجوع الی القرآن والسنہ اور موجودہ دور میں اس کی معنویت، ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ) (اداریہ) جنوری۔جون ۲۰۰۷ء، ص ۵۔۲۴

[۱۲] رجوع الی القرآن اور دوسرے مضامین، محولہ بالا، ص ۴۵

بھی بعض لوگ عام لوگوں کو ترجمہ قرآن کے ذریعہ قرآن پڑھنے کی دعوت کے خلاف ہیں [۱۳]۔ مزید براں وہ اس پہلو سے بھی اس مسئلہ پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ:

> آخر اللہ تعالیٰ نے اَن پڑھ اونٹ چرانے والوں سے قرآن کو سمجھنے کا مطالبہ کیا تھا تو اس سے زیادہ ترقی یافتہ لوگوں سے اس کا مطالعہ کرنے کو کہنا کیوں کر باعثِ تردد ہو سکتا ہے۔ رہا زبان کا فرق تو ہر سمجھ دار انسان کی طرح شاہ صاحب بھی جانتے تھے کہ ترجمے کے ذریعے اس مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے [۱۴]۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوتِ رجوع الی القرآن کا ماحصل واضح کرتے ہوئے مصنفِ محترم رقم طراز ہیں:

> صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (شاہ ولی اللہ) عام مسلمانوں اور ہدایتِ الٰہی کے درمیان صدیوں سے حائل تہ در تہ حجابات کو ہٹانے کا سب سے موثر طریقہ انسان کو قرآن تک پہنچا دینے کو سمجھتے تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ جب انسانوں کے خالق کا فیصلہ ہے کہ وہ اس کا کلام سمجھ سکتے ہیں تو کسی دوسرے کو اس مسئلہ میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترجمہ قرآن اور اسے بچوں کو پڑھانے کی تلقین کے پیچھے انکا حکیمانہ شعور ہے جس سے اکثر لوگ محروم رہے ہیں [۱۵]۔

پروفیسر نجات اللہ صدیقیؒ کی پیشِ نظر تحریروں کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں رجوع الی القرآن کے حوالے سے عام لوگوں کے علاوہ خواص کی توجہ بھی مبذول کرائی گئی ہے کہ ہر معاملے میں کتابِ ہدایت سے رجوع کرنے کی دعوت کے مخاطب عام و خاص سبھی لوگ ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے موجودہ صورتِ حال پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ علماء و دانش وروں نے عام طور پر درپیش مسائل میں اپنا رہنما فقہ اسلامی کو بنا رکھا ہے، خواہ ان مسائل کا تعلق معاشرت سے ہو یا معیشت و سیاست سے۔

یہ سوال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے علماء و دانشوران نئے مسائل کے حل کے لئے رجوع الی القرآن سے جھجکتے ہیں۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے، اس صورت حال کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جدید مسائل کے حل کے لئے بھی قرآن سے رجوع کیا جاتا۔ اس کی تیاری کے لئے

---

[۱۳] ماخذ سابق، ص ۴۵

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۴۴۔۴۵

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۴۵

ضروری ہے کہ نئے حالات کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے، سائنس و ٹکنالوجی کی ترقیات کے سماج پر اثرات کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے، زمانے کے انقلابات سے لوگوں کے مزاج، نفسیات اور طور و طریق میں جو تبدیلی آئی ہے اس پر بھی نظر رکھی جائے۔ انسانی مسائل کے حل کی خاطر قرآن کریم سے حصولِ رہنمائی اور رجوع الی القرآن کی دعوت کے لیے تیاری ان سب باتوں کو مدِّ نظر رکھنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسی ضمن میں یہ مطالعہ بھی مفید رہے گا کہ پہلے کے لوگوں نے بدلتے ہوئے حالات میں احکامِ الٰہی کی تعمیل کس طرح کی۔ ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد ہی رجوع الی القرآن کی دعوت اور اس پر عمل موثر و مفید ثابت ہوگا[۱۶]۔

زیرِ مطالعہ کتاب کے ایک مضمون ''علوم القرآن کی پہنچ اور اندازِ تخاطب'' میں مصنفِ محترم نے اس جانب توجہ دلائی ہے کہ عصرِ حاضر کے تقاضے کے مطابق قرآنی علوم کی توسیع و ترقی مطلوب ہے، یعنی اِن علوم کی نسبت سے اس پہلو سے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ ان کو کس طرح نئی وسعتوں سے روشناس کرایا جائے کہ دوسروں، بالخصوص مغربی اسکالرس و مستشرقین سے، تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے اپنی باتوں میں قرآنی روح پھونکی جاسکے۔ موجودہ حالات میں جب کہ پوری دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے، یہ دیکھنے کی اشد ضرورت ہے کہ ملکی و بین الاقوامی سطح پر خاص طور سے کن زبانوں میں قرآن کے ترجمے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے علومِ قرآنی پر عبور کے ساتھ مختلف زبانوں میں مہارت رکھنے والے اسکالرز درکار ہوں گے۔ دوسرے قرآن کے پیغام کو عام کرنے کے لئے یہ جائزہ بھی مفید رہے گا کہ لوگوں سے تبادلۂ خیال میں ابلاغ و ترسیل کے کون سے جدید ذرائع و مناہج اختیار کئے جائیں کہ وہ زیادہ موثر و مفید ثابت ہوں[۱۷]۔

آخر میں رجوع الی القرآن کی دعوت کی نسبت سے اس احساس کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے کے باشعور، حساس اور مصلحانہ کاوشوں میں مصروف رہنے والے ہر دور میں یہ دعوت دیتے رہے ہیں اور افرادِ ملت کو قرآن و سنت کے حوالے سے اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل حل کرنے اور حالات کو سدھارنے کی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں۔ ''معارف'' کے مدیر ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے اپنے مضمون ''زمینی حقائق کی روشنی میں اقدامات کریں'' (معارف، جنوری ۲۰۲۳ء، ص ۴۴-۵۵) میں مسلم معاشرے کی صورتِ حال کی عکاسی، کوتاہیوں و ناکامیوں کے اسباب کے تجزیے، کچھ حصول یابیوں کے

---

[۱۶] ماخذ سابق، ص ۹-۱۱

[۱۷] ماخذ سابق، ص ۱۳-۱۵

تذکرے اور عصرِ حاضر میں ملت کو در پیش اہم مسائل کے حوالے سے آخر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''ہمارے مسائل میں سرِ فہرست ہماری اخلاقی تنزلی کا مسئلہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عمدہ اخلاق کے حامل لوگ آج بھی ہماری سوسائٹی میں موجود ہیں، لیکن عمومی حالت اخلاقی تنزلی کی ہے''۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ ''اس اخلاقی ابتری کی ایک بڑی وجہ ہمارا کلام اللہ یعنی قرآن پاک سے دور ہونا ہے۔ آج اکثر ہندوستانی مسلمان قرآن پاک نماز میں یا ثواب کے لیے بغیر سمجھے ہوئے پڑھتے ہیں، لیکن ابدی ہدایت کے لیے نہیں پڑھتے ہیں جس کے لیے ہمارے اکثر لوگوں کو قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنا چاہئے جو ہماری تقریباً تمام زبانوں میں میسر ہے'' (حوالۂ مذکور، ص ۵۳۔۵۴)۔

بلاشبہ کتابِ ہدایت سے رجوع کرنے کی دعوت اہمیت و افادیت سے خالی نہیں، یہ آواز بار بار اور مختلف گوشوں سے بلند ہونی چاہئے، لیکن اسی سے جڑا ہوا ایک اور مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور وہ ہے: روز مرہ زندگی سے متعلق جو کچھ ہدایات و تعلیمات قرآن سے سمجھی جائیں، اخذ کی جائیں یا معلوم کی جائیں، انہیں صدقِ دل سے عملی جامہ پہنانا یعنی شب و روز بسر کرتے ہوئے انہیں زندگی میں دخیل بنانا۔

مدیر معارف نے اپنے مضمون کے آخر میں مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی جن برائیوں کی خاص طور سے نشان دہی کی ہے وہ ہیں: جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا اور امانت میں خیانت کرنا۔ زمینی حقائق یہ بتا رہے ہیں اور سماج کے مختلف طبقے کے لوگوں سے اس ناچیز کے تعلقات و معاملات اس کی شہادت دیتے رہتے ہیں کہ ان برائیوں میں (کم از کم) وعدہ خلافی (جو غلط بیانی اور جھوٹ ساتھ لاتی ہے اور گھر کے بچوں کی غلط تربیت کی راہیں بھی کھولتی ہے) معاشرے میں بری طرح سرایت کر گئی ہے۔ تقریباً ہر طبقے کے لوگ اس میں مبتلا نظر آتے ہیں، اِلّا ماشاء اللہ۔ اور کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وعدہ خلافی کو برائی یا گناہ کا کام سمجھا ہی نہیں جاتا اور ہم سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۴ کو بھول جاتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ عہد، وعدے کو پورا کرو، بے شک عہد، وعدے کے بارے میں (روزِ جزا) باز پرس ہو گی۔ اس لیے رجوع الی القرآن کی دعوت کے ساتھ ہی اس کے تقاضوں کو پورا کرنے، یعنی قرآنی ہدایات و تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے پر بھی زور، بلکہ خاص زور دینا چاہئے۔

حقیقت یہ کہ قرآن کریم کی مخلصانہ پیروی ہی ہمیں رحمتِ الٰہی کا مستحق بناتی ہے اور بنائے گی، اور بلاشبہ رحمتِ الٰہی سے شاد کام ہونے پر ہی ہمارے مسائل حل ہوتے ہیں اور ہماری مشکلات و پریشانیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ قرآن کا بہت ہی واضح اعلان ہے: وَہَـٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَٰهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الانعام: ۶: ۱۵۵) (اور یہ کتاب جو ہم نے نازل کی ہے سراپا خیر و برکت ہے، پس اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)۔ اللہ رب العزت قرآن و سنت سے ہم سب کا تعلق مضبوط فرمائے اور اللہ کرے ہمیں ہدایات ربّانی اور تعلیمات نبوی ﷺ کو سمجھنے اور ان پر عمل کی توفیق نصیب ہو۔ اللّھم تقبل منّا انّک انت السمیع العلیم۔

# مخطوطات کے لیے
# خلیل الرحمٰن داؤدی کی خدمات

**ڈاکٹر عارف نوشاہی**

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد، پاکستان

naushahiarif@gmail.com

خلیل الرحمٰن داؤدی (۲ مارچ ۱۹۲۳ء-۲۶ جنوری ۲۰۰۲ء) اردو زبان کے محقق تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر آئے۔ یہاں اردو ادبیات کے کئی کلاسک متون اور تذکرے مرتب کیے جو مجلس ترقی ادب، لاہور نے شائع کیے۔ مخطوطات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ذریعہ معاش بھی کتاب فروشی تھا۔ لیکن اس کے لیے دکان نہیں کھولی تھی بلکہ اپنے مکان پر بیٹھ کر ہی کاروبار کرتے تھے۔ کتب فروشی میں ان کی دل چسپی قدیم مطبوعات (ترجیحاً ۱۸۵۷ سے قبل) اور ہر طرح کے عربی، فارسی، اردو مخطوطات سے تھی۔ نیز بعض پرانے اخبارات کے مکمل فایل بھی برائے فروخت رکھتے تھے۔

ان کی وفات کو کم و بیش بیس سال ہو چلے ہیں۔ ان کی اچانک وفات کو باور کرنا اور اس سے پیدا ہونے والے خلا کے نقصانات سے نمٹنا مجھے دو طرح سے مشکل ہو رہا ہے۔ ایک، ان سے بیس پچیس سال سے تعلقِ خاطر تھا جس میں کمی کبھی نہیں آئی بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا؛ دوسرا، میں ان کی وفات سے چند روز پہلے اسلام آباد سے لاہور جا کر ان سے مل چکا تھا اور یہ ملاقات زندگی کی گرم جوشی اور رونق سے معمور تھی۔ آخری بار تیرہ جنوری ۲۰۰۲ء کو ان سے فون پر بات ہوئی تو معمول کی لحن داؤدی موجود تھی۔ تیرہ دن بعد یکایک ۲۶ جنوری کی صبح اُن کی وفات کی خبر وحشت اثر سننا میرے لیے ناقابل یقین تھا اور صدمہ انگیز بھی۔ میں اُس روز معمول کے مطابق صبح گورڈن کالج راول پنڈی، فارسی کی کلاس پڑھانے گیا کہ لاہور سے ڈاکٹر محمد سلیم مظہر صاحب کا فون آیا اور انھوں نے یہ خبرِ بد سنائی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس روز مجھ سے صدمے اور ملال سے کلاس میں کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے سالِ اوّل کے طالب علموں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو داؤدی صاحب کو جانتا ہو اور میں اُن کے سامنے داؤدی صاحب کا نام لے کر اپنے غم کا اظہار کر سکوں اور اپنے دُکھ کا بوجھ ہلکا کر پاؤں۔ میں نے طالب علموں کو کلاس سے جلد فارغ کیا اور تنہا یہ صدمہ برداشت کرنے کی ناکام کوشش کی۔

میں ۱۹۷۴ء میں کتاب خانۂ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان راول پنڈی سے وابستہ ہوا اور اس کے بعد ہی کسی وقت داؤدی صاحب سے تعارف ہوا، جب وہ اس کتب خانے کو فروخت کرنے کے لیے مخطوطات لایا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں ایران میں اسلامی انقلاب تک برقرار رہا۔ انقلاب کے فوراً بعد ایران کے حالات بگڑ گئے، عراق کے ساتھ جنگ شروع ہوگئی اور مرکز تحقیقات نے کئی سال تک کتب کی خریداری موقوف رکھی۔ اِدھر داؤدی صاحب نے اپنی توجہ فارسی مخطوطات سے ہٹا کر عربی مخطوطات کی طرف کرلی اور وہ اپنے نوادر کی فروخت کے لیے سعودی عرب، متحدہ عرب امارت، ملائیشیا اور برونائی میں نئے ادارے تلاش کرلیے۔ ۱۹۸۳ء میں جب مرکز تحقیقات فارسی نے کتب کی خریداری دوبارہ شروع کی تو میری وساطت سے مرکز نے داؤدی صاحب سے ان کا جمع شدہ فارسی مخطوطات کا خطیر ذخیرہ خرید لیا۔ اپنی دل چسپی کے چند مخطوطات میں نے بھی داؤدی صاحب سے خریدے۔ خود داؤدی صاحب مختلف اوقات میں پاکستان میں لاہور عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی اور نیشنل آرکائیوز آف پاکستان اسلام آباد کو مخطوطات فراہم کرتے رہے۔ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان اسلام آباد کو داؤدی صاحب کا فراہم کیا ہوا ذخیرۂ کتب جس میں قدیم مطبوعات شامل ہیں، انھی کے نام سے منسوب ہے اور نیشنل آرکائیوز کی ویب سائٹ پر اس کی فہرست موجود ہے۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جب یہاں مخطوطات اور دستاویزات جمع کرنے کے لیے نئے ادارے قائم ہوئے تو داؤدی صاحب ان کی آبیاری کرنے میں پیش پیش تھے۔ یہ وہ دور تھا جب تقسیم ہندوستان کے بعد، ہندوستان میں رہ جانے والے اور وہاں سے ہجرت کرنے والے مسلمان خاندانوں کے ذاتی ذخائر مخطوطات معرض خطر میں تھے۔ داؤدی صاحب نے اپنے وسائل سے ان کو حاصل کیا اور سرکاری کتب خانوں میں محفوظ کروایا۔ داؤدی صاحب کا اصول تھا کہ اپنے مخطوطات صرف سرکاری کتب خانوں کو بیچتے تھے، افراد کو نہیں بیچتے تھے۔ داؤدی صاحب کا خواب پاکستان میں قومی مرکز مخطوطات قائم کروانے کا تھا اور وہ بتایا کرتے تھے کہ وزارتِ ثقافت میں اپنے کسی علم دوست سیکرٹری کی وساطت سے حکومت پاکستان سے اس مقصد کے لیے ایک کروڑ کی گرانٹ بھی مختص کروا لی گئی۔ چونکہ ہمارے ہاں حکومتیں بدلنے سے پچھلے سارے منصوبے کالعدم ہوجاتے ہیں، اس لیے یہ خواب بھی تبدیلیِ حکومت کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اگر یہ مرکز قائم ہوجاتا یا اب بھی قائم ہو جائے تو ہم اپنے اسلاف کے باقی ماندہ علمی ذخیرے کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرسکتے ہیں جو اس وقت تیزی سے تباہ ہو رہا ہے۔

میں نے مولوی شمس الدین مرحوم[۱] کو تو نہیں دیکھا لیکن چوک انار کلی، مسلم مسجد لاہور کے نیچے ان کی دکان پر جانے والے بزرگوں مرحومین شرافت نوشاہی، حکیم محمد موسیٰ امرتسری، محمد ایوب قادری، محمد اقبال مجددی اور دیگر معاصرین سے سنا ہے کہ مولوی صاحب کی دکان صرف کتاب فروشی کا مقام نہ تھی بلکہ مولوی صاحب کی علمی معلومات اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے اطراف واکناف کے علما و فضلا کی مستقل نشست گاہ تھی۔ جب متلاشیانِ کتب ہر جگہ سے مایوس ہو کر مولوی صاحب کے پاس جاتے تو وہ خاطر داری بھی کرتے اور اپنی گرہ سے محققین کی مطلوبہ کتب کی عمدہ جلدیں بنوا کر انھیں تحفے میں پیش کرتے۔ کچھ یہی صورتِ حال میں نے داؤدی صاحب کے ہاں بھی دیکھی۔ وہ اپنے ہاں آنے والوں کی خوب خاطر مدارات کرتے بلکہ ساتھ ساتھ اپنے ملازم کو بلا کر فہمائش بھی کرتے رہتے کہ تواضع کے لیے فلاں چیز کیوں نہیں لائے ہو، جاؤ لے کر آؤ۔ مہمانوں کی علمی حاجت روائی بھی کرتے۔ انھیں جو حوالہ یا کتاب درکار ہوتی مہیا کرتے۔

داؤدی صاحب ہمارے محققین کے اس گروہ سے تھے، جو عربی، فارسی اور اُردو ادب کے مآخذ پر بیک وقت نظر رکھتے ہیں۔ اِس دور میں برّصغیر میں ایسے جامع الالسنہ محقق انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ سو داؤدی صاحب کے پاس تینوں زبانوں کے اساتذہ، محققین اور طلبہ رجوع کرتے اور وہ ان کی رہنمائی فرماتے، بلکہ اپنے خاص دوستوں کو ان کی ضرورت کے مطابق اپنے ذاتی خریدے ہوئے مخطوطات بھی بلا قیمت پیش کر دیتے۔ موجودہ دور میں جب کہ مطبوعہ کتاب خرید کر تحفے میں دینے میں بھی بار محسوس ہوتا ہے، داؤدی صاحب کا قیمتی مخطوطات دوستوں کو نذر کر دینا ان کی علم پروری اور فراخ دلی کی نشانیاں ہیں۔ مجھ پر ان کی خصوصی مہربانی تھی اور مخطوطات کے معاملے میں بڑا اعتماد رکھتے تھے۔ اگر ان کے پاس سلسلۂ نوشاہیہ کے کسی مصنف یا کاتب کا کوئی مخطوطہ آتا تو وہ بن مانگے ہی اس پر اپنے دستخط ثبت کر کے مجھے بھیج دیتے۔ میرے پاس عمر بخش نوشاہی رسول نگری کی پنجابی تصنیف آبِ حیاتی اور محمد ہاشم نوشاہی تھرپالوی کی مفتاح العلاج کا قلمی نسخہ جو ایک نوشاہی کاتب کا لکھا ہوا ہے، داؤدی صاحب کی اسی

---

[۱] مولوی شمس الدین مرحوم (وفات ۱۱ جنوری ۱۹۶۸ء) کی علم پروری، کتب کی داد و دہش اور دکان کی کیفیت پر کچھ مطبوعہ تاثرات حسب ذیل کتب میں مل جاتے ہیں۔ شریف احمد شرافت نوشاہی، شریف التواریخ، جلد سوم، حصہ دوازدہم، طبع لاہور، ۱۹۸۴ء، صفحات ۲۰۸-۲۰۹؛ محمد ایوب قادری، کاروانِ رفتہ، طبع کراچی، ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۲۹-۱۳۹؛ اقبال احمد فاروقی، تذکرہ علمائے اہلسنت و جماعت، لاہور، طبع لاہور، ۱۹۸۷ء، صفحات ۳۹۴-۳۹۶؛ محمد عالم مختار حق (مرتب)، نذر شمس، مطبوعہ لاہور، ۲۰۰۸ء

فیاضی کی یادگاریں ہیں۔

داؤدی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی کتب خانے کو مخطوطات فراہم کرنے سے پہلے ہر مخطوطے پر ایک تعارفی یادداشت لکھتے تھے، جس میں کتاب کا نام، مصنف کے مختصر حالات، کتاب کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہونے کی نشاندہی، اس کتاب کے دیگر معلومہ نسخوں کی تفصیل، ان نسخوں میں اپنے نسخے کا مقام و مرتبہ اور اپنے مآخذ کا نام لکھا ہوتا۔ ان کے پاس اس کام کے لیے حوالے کی بنیادی کتب موجود تھیں اور وہ بڑی محنت سے یادداشتیں تیار کرکے مخطوطات کے ساتھ لگاتے اور کتب خانوں کو بھیجتے۔ ان یادداشتوں کی ایک نقل اپنے پاس بھی محفوظ رکھتے۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے اسی نوعیت کی کثیر التعداد یادداشتیں ان کے پاس دیکھی تھیں جن کے ساتھ یہ وضاحت موجود تھی کہ یہ مخطوطات کس کتب خانے کے حوالے کیے گئے۔ ان یادداشتوں کا ایک حصہ یادنامۂ داؤدی (مرتبہ تحسین فراقی و جعفر بلوچ، دار التذکیر، لاہور، جنوری ۲۰۰۳ء) میں شائع ہو چکا ہے لیکن انھیں مکمل طور پر شائع ہونا چاہیے۔ ان یادداشتوں کی اشاعت سے دوگونہ فائدہ ہوگا۔ ایک داؤدی صاحب کی محنت اور نسخہ شناسی میں مہارت سامنے آئے گی، دوسرا ہزاروں کی تعداد میں ایسی کتابوں اور نسخوں کے کوائف اہلِ علم کو مہیا ہو جائیں گے جو اس وقت پاکستان یا پاکستان سے باہر کتب خانوں کو چلے گئے ہیں اور ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہمارے آبا کی یہ کتابیں اور علم و حکمت کے خزانے کہاں غریب الوطن ہیں۔

جب چالیس سال پہلے مرکز تحقیقاتِ فارسی، پاکستان میں موجود فارسی مخطوطات کی جامع فہرست تیار کروا رہا تھا تو میں نے لاہور کے متعدد اسفار میں داؤدی صاحب کے ہاں دستیاب فارسی مخطوطات کی فہرست تیار کرلی تھی۔ داؤدی صاحب اس زمانے میں نکلسن روڈ پر شوبرا ہوٹل کے پیچھے رہتے تھے۔ میری تیار کردہ فہرست، احمد منزوی کی مرتبہ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان کی چودہ جلدوں میں شامل ہے۔ اس فہرست کی اشاعت کے بعد بھی میں نے داؤدی صاحب کے ہاں متعدد قلمی نسخے دیکھے جو میری دو کتابوں سیہ بر سفید (مطبوعہ تہران ۲۰۱۱ء) اور فہرست نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان (مطبوعہ تہران ۲۰۱۷ء) میں متعارف ہوئے۔ بھلے آج وہ مخطوطات داؤدی صاحب کے ہاں دستیاب نہیں ہیں اور مختلف کتب خانوں کو جا چکے ہیں، لیکن اتنا تو ہوا کہ ہم سینکڑوں گمنام کتابوں، مصنفوں اور کاتبوں کے ناموں سے واقف ہو گئے۔ ابنِ ندیم (م۳۸۷ھ) نے جلد سازوں، کاغذ بنانے والوں اور کتب فروشوں کے ہاں جا کر کتابوں کے بارے میں معلومات جمع کی تھیں تب کہیں اس کی معرکہ آرا کتاب الفہرست مرتب ہوئی۔ ابنِ ندیم کی متعارف کردہ بیشتر کتب آج موجود نہیں ہیں لیکن

اس سے الفہرست کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ مزید بڑھ گئی ہے، کیوں کہ صدر اسلام کی تصنیفی سرگرمیوں اور علما کے طبقات واصناف سے واقفیت کا یہی ایک قابل اعتماد ماخذ ہے۔

داؤدی صاحب بتایا کرتے تھے کہ کسی مخطوطے پر محض ایک سطری جملہ ''اس کتاب کا کوئی اور نسخہ دستیاب نہیں ہے''، لکھنے کے لیے کہ انھیں ہفتوں، مہینوں بیسیوں کتب حوالہ دیکھنا پڑتی ہیں۔ جب تک مطمئن نہ ہوتے، اپنا نوٹ نہ لکھتے، نہ نسخہ فروخت کے لیے پیش کرتے۔ فارسی مخطوطات کہ حد تک میں جانتا ہوں کہ وہ جب اپنے ہاں کی تمام حوالہ جاتی کتب دیکھ چکتے اور خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی تو مزید اطمینان کے لیے نسخے کے اول وآخر کے اوراق کے عکس بنوا کر یا خود نسخہ ہی مجھے بھیج دیتے تاکہ میں اپنے ہاں دستیاب مآخذ کی مدد سے کتاب اور مصنف کی شناخت میں ان کی معاونت کروں۔ میں نے مقدور بھر اپنے پاس دنیا بھر بالخصوص ایرانی فہارسِ مخطوطات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کیا ہوا ہے، اس سے نسخوں کی تلاش میں بہت مدد ملتی۔

۱۹۷۹ء میں افغانستان پر روسی حملے اور بعد میں خانہ جنگی کے باعث جب وہاں سرکاری اور نجی کتب خانوں کے قلمی نسخے لُٹ پُٹ کر پاکستان پہنچے تو اس میں ایک تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو وسطی ایشیا اور خراسان کے مصنفین کی تصانیف تھیں اور افغانستان میں ان کی فہرست نویسی نہ ہونے کی وجہ سے گمنام پڑی تھیں۔ برّصغیر یا یورپ کی متداول فہرستوں میں بھی ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ داؤدی صاحب اس طرح کے غیر متعارف مخطوطات یا ان کی عکسی نقل استفسار کی غرض سے مجھے بھیجتے تو خود میرے لیے فارسی ادب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ایک نئی دنیا منکشف ہوتی۔ داؤدی صاحب کا منشا تو اپنے نسخے کی قدر وقیمت متعین کرنا ہوتا تھا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو مجھے جو شاندار علمی فوائد حاصل ہوتے رہے، اس کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہے۔ میں نے داؤدی صاحب کے فراہم کردہ ایسے مخطوطات پر متعدد مقالات لکھے جو ایران اور پاکستان میں شائع ہوئے۔ میں ان مقالات کو اپنا علمی اندوختہ سمجھتا ہوں۔ تحدیث نعمت کے طور پر ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

غالباً ۱۹۹۷ء کی بات ہے، داؤدی صاحب نے ایک ضخیم قلمی نسخہ مجھے بھیجا۔ کتاب کا نام مجموعۂ لطایف وسفینۂ ظرایف اور مصنف کا نام سیف جام ہروی مقدمے سے معلوم تھا لیکن داؤدی صاحب اس کتاب اور مصنف کے بارے میں مزید جاننا چاہتے تھے۔ میں نام کی حد تک اس کتاب اور اس کے مصنف سے پہلے متعارف ہو چکا تھا جب ۱۹۹۱ء میں دہلی سے ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے غزلہای حافظ بر اساس مجموعۂ لطایف وسفینۂ ظرایف از سیف جام ہروی ہم عصر حافظ شائع کی۔ میں نے داؤدی صاحب سے کہا کہ

جب تک ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب سامنے نہ ہو اس نسخے کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید اس کی پروانہ کرتا، لیکن داؤدی صاحب چونکہ بنیادی طور پر محقق تھے اُنھوں نے نذیر صاحب سے کتاب حاصل کرنے کی ٹھانی اور اپنے ذاتی ذرائع استعمال کرتے ہوئے، کوئی چھ ماہ کی تگ ودو کے بعد دہلی سے اپنے عزیزوں کی وساطت سے کتاب منگوانے میں کامیاب ہو گئے اور اس کا نسخہ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اتمام حجّت ہو گیا ہے اب تم اپنی تحقیق پیش کرو۔ میں نے اس کتاب اور داؤدی صاحب کے نسخے کی اہمیت پر ایک مفصل مضمون فارسی میں لکھا اور تہران سے چھپوا کر[۲] اس کی نقل مع مجموعۂ لطایف وسفینۂ ظرایف کے اصل نسخہ کے داؤدی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی اور ان سے درخواست کی کہ اس مخطوطے کو پاکستان ہی میں کہیں محفوظ کروائیں کیونکہ یہ نسخہ جس کتب خانے میں بھی جائے گا، اس کا سرمایۂ افتخار ہو گا۔[۳]

اب اس نسخے کی اہمیت کا حال سنیے: ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے بہت پہلے مجموعۂ لطایف وسفینۂ ظرایف کے دو نسخوں برٹش میوزیم (ناقص

---

[۲] یہ مضمون ''مجموعۂ لطایف وسفینۂ ظرایف: منبعی کہن در شعر فارسی و صنایع ادبی'' عنوان سے مجلّہ معارف، تہران، جلد ۱۶، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۹۹ء صفحات ۵۰۔۶۷ میں شائع ہوا اور اس کی باز گشت ایران اور ہندوستان میں سنائی دی۔ ایران سے ایک محقق سید علی میر افضلی نے مضمون پڑھ کر مجھے خط لکھا کہ اسے مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف میں منقول شیخ اوحدالدین اور عمر خیام کا کلام درکار ہے۔ ہندوستان سے خود ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر مختار الدین صاحب نے نسخۂ کابل کی بازیافت پر مسرت کا اظہار کیا۔

[۳] داؤدی صاحب کی وفات کے بعد، ان کے اہل خانہ نے یہ نسخہ کسی مخطوطہ فروش کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ مخطوطہ فروش وہ نسخہ لے کر فروخت کے لیے کتاب خانہ آستان قدس مشہد ایران پہنچا۔ آستان رضوی کے کتب خانے میں مخطوطات خریدنے والی ٹیم مخطوطہ شناس تھی انھوں نے بھانپ لیا کہ یہ وہی نسخہ ہے جو میرے مقالے (معارف) میں متعارف ہوا ہے۔ داؤدی صاحب کا نسخہ دراصل کابل یونیورسٹی کے دانشکدۂ ادبیات سے لایا گیا تھا اور ڈاکٹر نذیر احمد کے مقالے میں اس کے کوائف موجود ہیں جس کا اعادہ میں نے اپنے مقالے میں کیا تھا۔ آستان قدس رضوی کے ارباب کو جب یقین ہو گیا ہے کہ یہ نسخہ ''مالِ مسروقہ'' ہے تو انھوں نے اسے خریدنے سے گریز کیا اور مشہد میں موجود افغانستان قونصلیٹ کو خبردار کیا کہ آپ کے ملک کے ایک سرکاری کتب خانے کا نسخہ ہمارے پاس آگیا ہے ہم اسے آپ کی تحویل میں دینا چاہتے ہیں۔ دونوں حکومتوں کے اعلیٰ حکام نے معاملہ طے کیا اور نسخہ حکومت افغانستان کے حوالے کر دیا گیا جو اب آرشیف ملی افغانستان، کابل (۱۴.۷۶۱) میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

نسخہ Or.4110) اور کابل یونیورسٹی کے روٹو گراف کی مدد سے جو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے حاصل کیے گئے تھے، اپنی یادداشتیں تیار کی تھیں اور ۱۹۹۰ء میں جب وہ اپنا مسودہ شائع کرنے لگے تو لائبریری میں روٹو گراف دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن عکس لائبریری سے نہ مل سکا۔ اس کی مائیکرو فلم وہ ایک ایرانی محقق کو دے چکے تھے اور اُدھر کابل یونیورسٹی سے یہ اطلاع ملی کہ وہاں سے نسخہ غائب ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ''آن دفتر را گاو خورد و گاو را قصاب برد و قصاب در راہ مرد'' جیسی صورتِ حال سے دوچار تھے۔[۴] داؤدی صاحب کے پاس نسخہ دراصل کابل یونیورسٹی کا وہی گمشدہ نسخہ تھا۔ یہ کتاب فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ) کے زمانے میں ہندوستان میں مرتب ہونے والا قدیم ترین انتخابِ اشعار ہے، جس میں فارسی ادب کے ابتدائی ادوار کے شعرا کے ساتھ ساتھ معاصر شعرا کا کلام بھی نقل ہوا ہے۔ مصنف، حافظ شیرازی کا ہم عصر ہے اور اس نے حافظ کی ۱۲۶ غزلیں اس میں محفوظ کرلی ہیں، گویا یہ حافظ کے کلام کی ایک معاصر روایت ہے۔[۵]

۱۹۹۸ء میں داؤدی صاحب نے مجھے ایک اور مخطوطہ بھیجا۔ یہ نویں صدی ہجری میں خراسان کے ایک نقشبندی شیخ طریقت زین الدین محمود قوّاس (کمان گر) بہدادنی خوافی کے ملفوظات کا مجموعہ تھا جسے امیر سید محمد نے مرتّب کیا۔ یہ نسخہ بھی منحصر بہ فرد تھا۔ محمد ہاشم کشمی (وفات: ۱۰۴۳ھ) نے اپنی تصنیف نسمات القدس میں اس کتاب سے اقتباسات دیے ہیں لیکن اس کا نسخہ کہیں نہیں ملتا تھا۔ میں نے داؤدی صاحب سے اس کی اہمیت کا ذکر کیا اور اس پر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اُنھوں نے حسب معمول اپنی علم نوازی اور کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے نسخہ ہی مجھے مرحمت کر دیا۔ میں نے یہ متن اپنے تفصیلی مقدمے کے ساتھ ایران سے شائع کروایا۔[۶] میرے مقدمے میں داؤدی صاحب کے الطافِ

---

[۴] ڈاکٹر نذیر احمد نے اس ستم ظریفانہ صورتِ حال کا خود ذکر کیا ہے۔ دیکھیے: ان کا مقدمہ بر ''غزلہای حافظ بر اساس مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف از سیف جام ہروی ہم عصر حافظ''، طبع دہلی ۱۹۹۹ء، صفحہ ۵۵۔

[۵] مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف کی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر، ایک ایرانی طالب علم امید شاہ مرادی نے، راقم السطور کی مشاورت میں اسے مرتب کیا اور ۲۰۲۱ء میں فردوسی یونیورسٹی مشہد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

[۶] ملفوظات زین الدین محمود قواس بہدادنی خوافی کا متن مع مقدمۂ راقم السطور، نجیب مایل ہروی کے والد رضا مایل ہروی کی یاد میں ترتیب دیئے جانے والے مجموعۂ مقالات برگ بی برگی مرتبہ نجیب مایل ہروی، مطبوعہ تہران، ۱۳۷۸ شمسی/۱۹۹۹ء صفحات ۴۳۵-۵۱۷ میں شائع ہوا۔ بعد میں مقالات عارف، جلد اول طبع

کریمانہ کا ذکر موجود ہے۔

۲۰۰۱ء میں داؤدی صاحب نے ایک اور ضخیم مخطوطہ مجھے ارسال کیا۔ یہ "وزیری" تخلص کے شاعر کا فارسی کلیات تھا۔ مجھ سے داؤدی صاحب کا استفسار شاعر کے حالات کے بارے میں تھا۔ داؤدی صاحب کا تجسس اور استفسار اپنی جگہ درست تھا کیوں کہ بعد میں تحقیق سے پتا چلا کہ وزیری تخلص کے کسی شاعر کا حال نہ فارسی کتبِ تذکرہ میں ملتا ہے نہ فارسی ادب کی تاریخوں میں۔ اس کلیات کے داخلی شواہد سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا ہے کہ شاعر تاتاری نژاد ہے اور چین اس کا وطن ہے۔ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور یہاں اکبر، جہانگیر، اور خانِ خاناں کی مدح میں قصیدے لکھے۔ وہ ایک خمسہ کے علاوہ آٹھ دیگر تصانیف کا مالک بھی ہے۔ اس نسخے میں اس کی چھوٹی چھوٹی مثنویوں، قصیدوں اور غزلوں کے کوئی ساڑھے چودہ ہزار اشعار درج ہوئے ہیں۔ میں نے اس پر بھی مفصل مقالہ لکھا۔[۲] آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ چین اور ہندوستان کے ادبی رشتوں کے حوالے سے یہ نسخہ کس قدر اہم ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد داؤدی صاحب کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ شاہِ ایران کے جانے کے بعد دنیا بھر کے مراکزِ مخطوطات اور نوادر کے نیلام گھروں میں اب فارسی مخطوطات کی پہلے جیسی قدر و قیمت نہیں رہی۔ اس لیے داؤدی صاحب نے اپنی توجہ عربی مخطوطات کی فراہمی کی طرف مبذول کر لی۔ لیکن فارسی قلمی نسخے جمع کرنا اُنھوں نے یکسر موقوف نہیں کیا تھا۔ ان کی وفات تک ان کے پاس کوئی ایک ہزار فارسی مخطوطات جمع ہو چکے تھے۔ مجھے وہ بار بار پیغام بھیجتے رہے کہ کچھ وقت نکال کر لاہور آؤں اور ان کا ذخیرہ دیکھوں۔ مجھے یہ موقع ان کی وفات سے صرف تین ہفتے پہلے ملا اور میں نے دو اور پانچ جنوری ۲۰۰۲ء کو دو الگ الگ نشستوں میں ان کے ہاں موجود تمام فارسی مخطوطات ایک ایک کر کے دیکھ لیے اور چند ایک اہم ترین نسخوں کے بارے میں یادداشتیں بھی تیار کر لیں۔ پہلی نشست میں پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی، استاد شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی، لاہور اور دوسری نشست میں پروفیسر محمد رفیق صاحب، استاد شعبۂ فارسی، گورنمنٹ کالج [یونیورسٹی]، لاہور بھی شریکِ

---

تہران، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۰۔ ۱۶۱ میں مقدمہ اور مقالات عارف، جلد دوم، طبع تہران، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷۶۔ ۴۵۹ میں مقدمہ مع متن مکرر شائع ہوا۔

[۲] دیکھیے: عارف نوشاہی، "وزیر/وزیری (گیارھویں صدی ہجری کے ایک تاتاری نژاد چینی شاعر کے حالات اور فارسی شاعری) فکر و نظر، اسلام آباد، جلد ۴۲، شمارہ ۲ ، شعبان ۔ ذوالقعدہ ۱۴۲۵ھ / اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۷۱۔ ۱۲۳

مجلس تھے۔ بعد میں سید اویس علی سہروردی مرحوم مدیر مجلّۂ سہر وردو اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور کو بھی داؤدی صاحب نے خود فون کرکے بلوالیا اور ہم نے مل کر مخطوطات دیکھے۔ اب کی بار مجھے اس ذخیرے میں افغانستان کے نوادر کے ساتھ ساتھ سابق ریاست بہاولپور کے مصنفین اور وہاں سے لائے گئے نسخے بھی ایک خاص تعداد میں دکھائی دیئے جو کم از کم میرے لیے نئے تھے۔ یہ نسخے بہاولپور کے کسی کتب فروش سے آئے تھے جس کی مہر نسخوں پر ثبت تھی۔ انھی میں عبدالستار بن قاسم لاہوری کی تصنیف مجالس جہانگیری کا نسخہ بھی تھا جو نوابان بہاول پور کے ''کتب خانۂ سلطانی'' کی زینت رہ چکا تھا۔ بعد میں راقم السطور اور ڈاکٹر معین نظامی نے اسے مرتّب کیا اور ۲۰۰۶ء (طبع اول) اور ۲۰۲۲ء (طبع دوم) میں تہران سے شائع کروایا۔ ہماری اطلاع کے مطابق نسخۂ داودی نہ صرف اس کتاب کا نسخۂ وحید ہے بلکہ اس کتاب کا تعارف بھی پہلی بار اسی نسخے کے ذریعے ہوا کیونکہ آج تک کسی مورّخ اور تذکرہ نگار نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ مجالس جہانگیری کی اشاعت سے علمی دنیا جہانگیر بادشاہ کے مزاج اور حکومتی پالیسیوں کے ایک نئے پہلو سے متعارف ہوئی۔ مشرق و مغرب میں اس کتاب کے بارے میں اب تک اتنے مقالات لکھے جاچکے ہیں کہ ان کے مجموعے سے بجاے خود ایک کتاب بن سکتی ہے۔ ہم نے بجا طور پر مجالس جہانگیری کے تہران ایڈیشن کا انتساب خلیل الرحمان داؤدی صاحب کے نام کیا کہ وہی اس کے مستحق تھے۔

داؤدی صاحب سے آخری ملاقات ان کے مکان کے جس کمرے میں ہوئی، اس میں ایک طرف ان کا پلنگ بچھا ہوا تھا اور چاروں طرف کتابوں اور مخطوطوں کے بنڈل رکھے تھے۔ وہ اسی پلنگ سے اُٹھ کر ہسپتال منتقل ہوئے تھے، لیکن زندگی نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ صحت یاب ہوکر مخطوطات کے اس حصار میں واپس آتے اور ان مخطوطات کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے۔ میں نے ان سے اپنی آخری ملاقات سہروردی صاحب کی موجودگی میں تجویز پیش کی تھی کہ داؤدی صاحب اپنے نام پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ایک ''گوشہ'' قائم کریں اور یہ تمام مخطوطات وہاں جمع کروادیں۔ داؤدی صاحب نے اس مجلس میں تو اپنے ردِّ عمل کا اظہار نہ کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان سے آئندہ ملاقاتوں پر اس تجویز پر جب دوبارہ گفتگو ہوتی تو میں انھیں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے پر قائل کرلیتا۔ لیکن افسوس کہ ہمارا یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور داودی صاحب کی وفات کے بعد ان کے ورثہ کی طرف سے ان کے جمع کردہ مخطوطات مختلف افراد (کتب فروشوں) اور کتب خانوں کو فروخت ہونا شروع ہوگئے۔ اگرچہ اس میں عیب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ داؤدی صاحب نے یہ مخطوطات اسی غرض

سے خرید رکھے تھے۔ لیکن علمی درد مندی اور دل سوزی کی وجہ سے یہ بات منہ سے نکل رہی ہے کہ کاش ہماری جامعات یا عجائب خانے ان مخطوطات کو ملک میں محفوظ کر لیتے۔ اب بھی ان کے ورثہ کے پاس کافی مقدار میں مخطوطات موجود ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی داؤدی صاحب کے لواحقین سے ان کا چھوڑا ہوا یہ قیمتی ذخیرۂ کتب مخطوطات ایک معقول معاوضہ ادا کر کے حاصل کر سکتی ہے۔ اس کام سے تین فوائد تو فوری طور پر بہ یک وقت حاصل ہوں گے۔ ایک یہ مخطوطات ہمیشہ کے لیے پاکستان اور علمی شہر لاہور میں محفوظ ہو جائیں گے جو اس شہر علم وادب کے شایانِ شان ہے، دوسرا یونیورسٹی کے کتب خانے کے وقار میں اضافہ ہو گا اور تیسرا یہ کہ داؤدی صاحب کے لواحقین کے مادّی حقوق کا تحفظ ہو جائے گا۔ مستقبل میں دائمی طور پر محققین کو اس ذخیرے سے جو معنوی فوائد حاصل ہوتے رہیں گے، اس بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

بد شگونی کی بات کرنا اچھا تو نہیں ہے لیکن محض ماضی کی ایک غفلت سے سبق حاصل کرنے کے لیے عرض کروں گا کہ خان بہادر پروفیسر مولوی محمد شفیع پنجاب یونیورسٹی کے فاضل استاد تھے جن کے علمی کارناموں اور مشرقی تحقیقات کی دھوم چار دانگ عالم میں ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی ذوق کے پیشِ نظر اپنے گھر میں نفیس مخطوطات کا ذخیرہ جمع کیا تھا۔[۸] ان کی وفات کے بعد اس کتب خانے کا حشر کیا ہوا؟ وہ کتب خانہ چوروں اور دلالوں کے ہتھے چڑھا اور کوئی کتاب یہاں بکی، کوئی وہاں۔ خدا داؤدی صاحب کی روح کو شاد فرمائے کہ ان کی کوششوں سے یہ کتب خانہ مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچ گیا اور اس کے کچھ بچے کھچے مخطوطات نیشنل لائبریری آف پاکستان، اسلام آباد میں محفوظ ہو گئے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ جس یونیورسٹی کی تحقیقی روایت کی شناخت مولوی محمد شفیع کے نام سے ہے، اس کی ناک کے نیچے اس شخص کا کتب خانہ برباد ہوا اور پنجاب یونیورسٹی اپنے اس محسن استاد کے گنجِ گراں مایہ کو اپنے ہاں محفوظ کرنے میں ناکام رہی۔ جب ہمارا تہذیبی سرمایہ کسی دوسرے ملک کے کتب خانے کی زینت بنتا ہے تو غنی کشمیری کا یہ شعر حسبِ حال ہوتا ہے:

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ روشن کرد نورِ دیدہ اش چشم زلیخا را

[۸] ان نفائس کی تفصیل فہرست مخطوطاتِ شفیع مرتبہ محمد بشیر حسین طبع لاہور، ۱۹۷۲ء میں دیکھی جاسکتی ہے۔

# مولانا اشرف علی تھانویؒ
# اور ان کی تفسیر بیان القرآن

فضل الرحمن اصلاحی

معاون رفیق دارالمصنفین

islahi1980@gmail.com

مولانا اشرف علی تھانویؒ ممتاز عالم دین، عظیم مفسر قرآن اور اپنے زمانے کے صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ معتقدین نے آپ کو ''حکیم الامت'' کا لقب دیا تھا۔ وہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۲ء) تھانہ بھون ضلع مظفر نگر[1] میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو تھانہ بھون میں ہوا۔

**نسب اور خاندان:** ہندوستان میں مسلم حکومت سے قبل راجا بھیم نے اپنے نام سے ایک قصبہ ''تھانہ بھیم'' کے نام سے بسایا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اس کا نام محمد پور رکھا، جس کا ثبوت اس وقت کی شاہی دستاویزات میں ملتا ہے۔ مگر یہ نام مقبول نہ ہو سکا اور وہی پرانا نام کثرتِ استعمال سے تھانہ بھیم کی جگہ ''تھانہ بھون'' رائج ہو گیا۔

مولانا تھانویؒ کے اجداد زمانۂ دراز سے اسی قصبے میں اقامت گزیں تھے۔ آپ کے والد کا نام شیخ عبد الحق تھا جو میرٹھ میں مختار عام تھے۔ وہ فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے، حافظ قرآن تو نہ تھے لیکن قرآن مجید کی تلاوت پوری صحت کے ساتھ کرتے تھے۔ مولانا کے ددھیال کے اجداد نسبتاً فاروقی تھے۔ ان میں ایک مولانا صدر الدین جہاںؒ تھے (جو قاضی محمد نصر اللہ خان) کے ہم عصر تھے اور ان کا نام عہد اکبری کے دستاویزات میں ملتا ہے۔ مولانا تھانویؒ کی والدہ بھی ایک صاحبِ نسبت خاتون تھیں۔ مولانا کے قریبی اجداد تھانیسر ضلع کرنال سے ہجرت کر کے تھانہ بھون میں آباد ہوئے۔ ننہالی اجداد علوی تھے جنہوں نے پہلے جھنجھانہ ضلع شاملی میں سکونت اختیار کی، بعد میں وہ لوگ بھی تھانہ بھون میں آکر آباد ہو گئے[2]۔

---

[1] اب یہ ضلع شاملی میں واقع ہے۔

[2] مولانا محمد اسلم شیخوپوری، بڑوں کا بچپن، زمزم بک ڈپو، دیوبند، ۱۹۹۶ء ص ۵۹۔۶۰

**تعلیم و تربیت:** مولانا تھانویؒ نے ابتدائی تعلیم کے بعد قرآن مجید کے اکثر حصے حافظ حسین علی دہلوی مرحوم سے حفظ کیا۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں میرٹھ میں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، پھر تھانہ بھون میں اپنے ماموں جناب واجد علی مرحوم اور مولانا فتح محمدؒ سے پڑھیں۔ اس کے بعد دارالعلوم دیو بند میں ۱۲۹۵ھ میں داخلہ لیا اور وہیں سے ۱۳۰۱ھ میں ۲۱ سال کی عمر میں سندِ فضیلت حاصل کی اور دستارِ فضیلت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے نامور عالم دین نے باندھی۔ زمانۂ طالب علمی سے الگ تھلگ رہتے۔ بہت زیادہ میل جول کا مزاج نہیں تھا، اگر کتابوں سے طبیعت اوب جاتی تو اپنے استاد مولانا یعقوب ناتوتویؒ (سابق صدر مدرس دارالعلوم دیو بند) کی خدمت میں چلے جاتے۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوری ان کی جامعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ وہ بزرگ ہیں، جو ہر فن میں ماہر ہونے کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کے خلیفہ رشید تھے، ان کی اس جامعیت کی وجہ سے ان کا حلقۂ درس "حلقہ توجہ" بھی ہوتا تھا، اور ذہن و قلب کی تعلیم ایک ساتھ ہوتی تھی۔ افسوس کی آج دینی درسگاہیں جامعیت فیض سے محروم ہیں۔[۳]

**اساتذۂ کرام و مشائخ:** مولانا یعقوب ناتویؒ، شیخ الھند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا سید احمد دھلویؒ، قاری محمد عبداللہ مہاجر مکیؒ اور مولانا عبدالعلیؒ وغیرہ ان کے مشہور اساتذہ میں شامل ہیں۔ اور تزکیۂ نفس کا عمل حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی زیر نگرانی ہوا۔

**عملی زندگی کا آغاز:** مولانا تھانویؒ پہلے کانپور کے ایک مدرسہ "فیض عام" میں مدرس ہوئے، اس کے بعد اس مدرسہ کے نظم و نسق سے غیر مطمئن ہو کر لا تعلق ہو گئے اور وہاں کی جامع مسجد میں درس دینے لگے اور اسی میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "جامع العلوم" رکھا۔ کانپور سے واپسی کے بعد تھانہ بھون میں مستقل قیام کیا، اور اپنے مخصوص خانقاہی نظام کے ذریعہ بہت سے اکابر اہل علم کی تزکیہ و تربیت کی ۔ جیسے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر عبدالباری ندوی وغیرہ اور ساتھ ہی بہت سے علمی کارنامے انجام دیے مولانا تھانویؒ ایک اصولی اور بہت ہی منضبط انسان تھے۔ وقت کی پابندی ان کی معروف صفت تھی۔ ایک بار ان کے استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھانہ بھون گئے ہوئے تھے۔ ان کی صحبت میں چند دیر بیٹھے رہے، پھر ان سے باادب

---

[۳] ماخذ سابق ص ۶۵

مخاطب ہوئے: اس وقت میرے لکھنے کا معمول ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے معمول میں مشغول ہو جاؤں۔ شیخ الہندؒ نے بخوشی معمول پورا کرنے کی اجازت دی۔ کچھ دیر معمول کو پورا کرنے کی کوشش کی، پھر جی نہ لگا تو خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے۔ شیخ الہندؒ نے جلد واپسی کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ معمول میں خلل نہ آئے، اس لیے گیا تھا، اور اب دل نہیں لگ رہا تھا، اس لیے جلد واپس آگیا۔ اس سے ان کی ایک منضبط زندگی کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے معمولات کو ہر ماحول میں پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حکیم محمد سعید مرحوم نے لکھا ہے کہ ایک بار ہم دونوں بھائی، میں اور میرے بڑے بھائی حکیم عبد الحمید دہلوی، دہلی سے ان کے نظام الاوقات کو دیکھنے کے لیے تھانہ بھون گئے، اور چند روز وہاں قیام کرکے ان کے معمولاتِ زندگی کا بغور مشاہدہ کرتے رہے۔ اسی بنا پر حکیم محمد سعید مرحوم کی زندگی بھی ایک مربوط زندگی تھی۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ مولانا تھانویؒ کے علمی کارنامے پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ــــ اس دور کے شیخ طریقت، مشہور عالم اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے [۴]۔ سلوک و تصوف اور فقہ و حدیث کے موضوع پر سینکڑوں کتب و رسائل تالیف کرنے کے علاوہ مولانا نے ایک مفید تفسیر بھی بیان القرآن کے نام سے لکھی ہے، جس کے ساتھ ترجمہ قرآن بھی شامل ہے۔[۵]

**تھانہ بھون میں مستقل قیام:** مولانا تھانویؒ نے ۱۴ سال کا ایک لمبا عرصہ درس و تدریس میں کان پور میں گزارا۔ اسی دوران ان کے اندر مسلمانوں کی اصلاح عقائد و اعمال کے لیے شدید جذبہ پیدا ہوا جیسا کہ ڈاکٹر عبد الحئیؒ لکھتے ہیں:

> ــــ جس سے حضرتؒ ہمہ وقت متاثر رہنے لگے اور موجودہ انہماک و اشغال کی زندگی سے طبیعت گھبرانے لگی۔ مستقبل میں پیش نظر مقاصد کے حصول کے لیے فراغت قلب و یکسوئی درکار تھی۔ چنانچہ مدرسہ کی ملازمت ترک کرنے کا ارادہ کر لیا اور چند وجوہات اور اعذار پیش کرکے آخر

---

[۴] مولانا عبد الحئی عارفیؒ کی روایت کے مطابق مولانا تھانویؒ کی صرف شائع شدہ مواعظ کی تعداد تقریباً چار سو سے زائد ہیں (بیان القرآن جلد اول، ص: ۷)

[۵] مولانا ضیاء الدین اصلاحی، اردو تفاسیر کا ایک جائزہ، علوم القرآن ششماہی، علی گڈھ (جولائی دسمبر ۲۰۰۶ء) ـ ص ۶۱

کار ۱۳۱۵ھ میں سبک دوشی حاصل کرلی اور اپنے وطن تھانہ بھون تشریف لے گئے اور اس کی اطلاع اپنے پیر ومرشد (حاجی امداد اللہؒ) کو کردی۔ وہاں سے جواب آیا:

بہتر ہوا آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیرہ کو فائدہ ظاہری وباطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ اور خانقاہ کو از سر نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور آپ کا مجھے خیال رہتا ہے۔[۶]

مولانا تھانویؒ نے پہلا حج اپنے والد کی معیت میں کم عمری میں کیا تھا۔ اس دوران جب مکہ میں ان کی ملاقات مشہور بزرگ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے ہوئی تو، وہ اپنے پاس انہیں کچھ دنوں کے لیے روکنا چاہا ،تو اس کے لیے شفقت پدری کے غلبے کی بنیاد پر، ان کے والد اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس پر حاجی امداد اللہؒ نے کہا کہ آئندہ جب کبھی حج کے لیے آئیں، تو میرے پاس کم از کم چھ ماہ قیام کی نیت سے آنا۔ چنانچہ مولانا تھانویؒ نے دوسرا حج ۱۳۱۰ھ میں کیا اور حاجی امداد اللہ مکیؒ کی ایماء پر چھ ماہ مکہ میں قیام کیا۔ اس دوران وہ ان کا تزکیہ اور باطنی اصلاح برابر کرتے رہے۔ واپسی میں انہیں یہ قیمتی نصیحت اور وصیت کی:

دیکھو وطن پہنچ کر تم کو باطنی کیفیات میں ایک حالت پیش آئے گی۔ گھبرانا نہیں۔ مجھ کو مطلع کرتے رہنا۔ دوسرے یہ کہ جب مدرسے کی ملازمت سے دل برداشت ہو تو پھر وطن پہنچ کر ہماری خانقاہ اور مدرسہ میں توکلاً علی اللہ مقیم ہو جانا، تم سے ان شاء اللہ تعالی خلق کثیر کو نفع پہنچے گا۔[۷]

**مولانا تھانویؒ کی چند مشہور کتابیں:** امداد الفتاویٰ، بہشتی زیور، بہشتی ثمر، حیاۃ المسلمین، آداب المعاشرۃ، آدابِ زندگی، اصلاح انقلاب امت، اصلاح الرسوم، الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ، وعظِ اسلام حقیقی، محاسنِ اسلام، فروع الایمان، اصلاح الخیال، قصد السبیل، بیان القرآن، ترجمہ قرآن وغیرہ۔[۸]

**تفسیر بیان القرآن کا مختصر تعارف:** مولانا تھانویؒ نے تفسیر لکھنے کا کام ۱۹۰۲ء مطابق ۱۳۲۰ھ میں شروع کیا اور ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۵ھ میں مکمل کیا۔[۹] یہ تفسیر بارہ جلدں میں ہے اور پہلی بار ۱۹۰۹ء مطابق ۱۳۲۶ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کے آج تک متعدد ایڈیشن شائع ہوتے

---

[۶] مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، جدید ایڈیشن ۱۴۲۶ھ جلد اول ص ۷

[۷] ماخذ سابق ص ۶

[۸] ماخذ سابق، ص ۷

[۹] تفسیر کے اختتام پر ان الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کیا ہے: وقد کمل، والحمد للہ الحمید، تفسیر القرآن المجید فی یوم الخمیس لمنتصف [جمادی الثانی] ۱۳۲۵ من ھجرۃ (ص ۶۷۴)۔

رہے ہیں۔ میرے پیش نظر "تفسیر بیان القرآن مکمل" ہے جو کتب خانہ نعیمیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ اور یہ کل تین ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس تفسیر پر ایک جامع تعارف و تقدیم فقیہ العصر مولانا عبدالشکور ترمذیؒ کے قلم سے ہے جن کا تعلق مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا سے ہے۔

اس تفسیر بیان القرآن اور اس کے تمام متعلقہ رسائل کی جدید اشاعت اس قدیم اور محقق ایڈیشن کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، جس پر مولانا تھانویؒ کی تصدیق اور دستخط ہیں۔ یہ نسخہ ۱۳۵۳ھ میں مطبع اشرف المطابع تھانہ بھون سے شائع ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر مختصر تعارف ان الفاظ میں لکھا گیا ہے: مکمل تفسیر بیان القرآن مع مسائل السلوک من کلام ملک الملوک (عربی)، رفع الشکوک (اردو ترجمہ)، مسائل السلوک (اردو)، وجوہ المثانی مع توجیہ الکلمات والمعانی (عربی)۔

**خصوصیات تفسیر:** مولانا تھانویؒ نے اپنی تفسیر کے متعلق جو اصولی گفتگو کی ہے اس کا نام خطبۂ تفسیر بیان القرآن رکھا ہے۔ اس کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

**اول:** قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا ہے، جس میں قابل فہم ہونے کے ساتھ تحت لفظی کی بھی رعایت ہے۔

**دوم:** ترجمہ میں خالص محاورات استعمال نہیں کیے گئے، دو وجہ سے، اول میں تو قصباتی ہوں، محاورات پر عبور نہیں۔ دوسرے یہ کہ محاورات ہر مقام کے جدا جدا ہوتے ہیں، اگر دہلی کے محاورات لیے جاتے، اہل لکھنؤ نہ سمجھتے، ان دونوں کے محاورے حیدرآباد اور مدراس والے نہ سمجھتے۔ غرض ایسے محاورات عام فہم نہیں ہوتے، اور اردو ترجمہ کم از کم ایسا ہو کہ قریب قریب ہندوستان کے سب حصے تو اس کو سمجھ جاویں، اس لیے کتابی زبان لی ہے کہ فصاحت کے ساتھ اس میں سلاست بھی ہے۔

**سوم:** نفسِ ترجمہ کے علاوہ جس مضمون کو بہت ضروری دیکھا کہ اس پر توضیح ترجمہ کی موقوف ہے، یا کوئی شبہ خود قرآن کے مضمون سے ظاہراً پیدا ہوتا تھا، اس کا جواب یا مضمون قرآنی کسی مشہور تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتا تھا، اس کی تحقیق یا اسی قسم کی کوئی ضروری بات ہوئی، اس کو "ف" بنا کر بڑھا دیا۔

**چہارم:** جس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال مفسرین کے ہیں، ان میں سے جس کو ترجیح معلوم ہوئی، صرف اسی کو لے لیا، بقیہ سے تعرض نہیں کیا۔

**پنجم:** مطلب قرآنی کی تقریر کہیں تو اس طرح کی ہے کہ مضمون کا ارتباط خود ظاہر ہو جاوے اور کہیں ایک سرخی ربط کی لکھ کر اس کی تقریر کر دی گئی ہے۔

**ششم:** اختلاف امور کی تفسیر میں صرف مذہب حنفی لیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب بشرطِ ضرورت حاشیہ میں لکھ دیے گیے ہیں۔

**ہفتم:** چونکہ نفع عوام کے ساتھ افادۂ خواص کا بھی خیال آگیا، اس لیے ان کے فائدے کے واسطے ایک حاشیہ بڑھادیا ہے، جس میں مکیت و مدنیت سور وآیات وغیرہ، مشہور لغات وضروری وجوہ بلاغت و مغلق ترکیب و خفی الاستنباط فقہیات وکلامیات واسبابِ نزول وروایات واختلاف قرأت مغیرہ ترکیب یا حکم وتوجیہ ترجمہ وتفسیر ایجاز کے ساتھ مذکور ہیں، جس کو متوسط درجے کا طالب علم بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔۔۔[10]

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر مولانا تھانوی اپنی تفسیر کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مضامین کا جمع کرنا مقصود نہیں، بلکہ محض حلِ قرآن ورفع ضرورت، لیکن باوجود اتنی رعایت کے بھی غیر علماء وطلبہ کے لیے، بہت سے مقامات میں علماء سے استغناء نہیں ہوسکتا، لہذا مناسب بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے حضرات اپنے مطالعہ وفہم پر اعتماد نہ فرماویں، بلکہ حسبِ ضرورت علماء یا منتہی طلبہ سے اس کو سبقاً سبقاً سمجھ کر پڑھ لیں، ورنہ اقل درجہ اتنا تو ضرور ہے کہ مطالعہ کے وقت جہاں ذرہ برابر بھی اشتباہ رہے وہاں خود غور کرکے نہ نکلیں، بلکہ پنسل سے نشان کرکے علماء سے وہ عبارت دکھاکر حل کرلیں اور بدون اس کے احتمال بلکہ یقین غلط فہمی کا ہے۔[11]

**اسلوب وانداز:** بیان القرآن ایک جامع تفسیر ہے۔ جمہور مفسرین کی تفسیروں سے اس میں کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانا چوں کہ ایک مصلح بھی تھے، اس لئے اس تفسیر میں مسلمانوں کے عقائد ورسوم کی اصلاح پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا تھانویؒ قرآن مجید میں نظم وربط آیات کے قائل تھے، اس وجہ سے اس پہلو پر بھی توجہ کی ہے لیکن آیات کی باہمی مناسبت اور ربطِ سور کا کام اس میں اجمالاً ہی کیا گیا ہے۔ قواعد نحو وصرف بھی بیان کئے گئے ہیں، ساتھ ہی جابہ جا سلوک وتصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تفسیر کا ترجمہ تحت اللفظ ہونے کے باوجود سلیس اور عام فہم ہے۔ تفسیر میں بھی تفہیم کا انداز پر اثر ہے۔ مولانا اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

اصلاحات اس تفسیر کی یہ ہیں کہ جو عبارت خطوطِ ہلالیہ سے خارج ہے، وہ ترجمہ ہے اور جو خطوط ہلالیہ کے اندر محصور ہے، وہ ترجمہ سے زائد ہے اور باوجود کافی ہونے اس فارق کے زیادہ احتیاط

---

[10] ماخذ سابق ص ۱۹۔۲۰

[11] ماخذ سابق، ص ۵۔۶

وتوضیح کے لیے ترجمہ پر خط بھی کھینچ دیا ہے، جو علامت متن کی ہے، اور ترجمہ میں اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ادھر جہاں قرآن لکھا ہے، اس کے نیچے بھی ترجمہ لکھ دیا ہے۔۔۔ جہاں استاذی لکھا ہے، اس سے مراد حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جہاں مرشدی لکھا ہے، اس سے مقصود حضرت مولانا الحاج محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہ ہیں۔ جہاں کوئی ماخذ نہیں لکھا وہ احقر نے اپنی رائے و یادداشت سے لکھ دیا ہے۔[12]

آگے مزید اس تفسیر کے متعلق ان الفاظ میں وضاحتیں کی ہیں:

۱۔ ہر جگہ تفسیر میں اتباع سلف صالح کا کیا ہے۔ متأخرین کے اقوال کو جو سلف کے خلاف تھے نہیں لیا۔

۲۔ جہاں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، ان میں سے جس کو روایت یا ذوق عربیت سے راجح سمجھا، صرف اسی کو اختیار کر لیا۔

۳۔ جن آیات کی تفسیر میں حدیث مرفوع آئی ہے، اس کے مقابلے میں کسی کا قول نہیں لیا گیا۔

ان کے علاوہ مزید تفصیلات ''ذکر بعضے امور مرعیہ ملتزمہ در تحریر تفسیر ہذا'' عنوان کے تحت مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔[13]

**طریقۂ ترجمہ و تفسیر:** اس کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں تا کہ ان کے ذریعے ترجمہ و تفسیر کا رنگ اور انداز بیان کا علم ہو سکے۔ چنانچہ پہلے ایک آیت لکھی گئی، پھر اس کے نیچے اس کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ف لکھ کر اس کی وضاحت و تفسیر کی گئی ہے۔ مثلاً: الحمد للہ رب العالمین

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔

**ف:** مخلوق کی الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے۔ مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن۔[14]

سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرۃ کی تفسیریوں کی گئی ہے: پہلے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کے درمیان ربط کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک آیت کا ترجمہ پھر اس کی تفسیر کی گئی ہے:

سورۃ الفاتحہ سے اس سورت کا ربط یہ ہے کہ اس میں راہِ ہدایت کی درخواست کی گئی تھی اور اس میں درخواست کی منظوری ہے کہ یہ کتابِ ہدایت ہے۔ اس پر چلو۔[15]

---

[12] ماخذ سابق ص ۲۰

[13] بیان القرآن جلد اول ص ۲۱

[14] ماخذ سابق ص ۲-۳

الم (حروف مقطعات) کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے۔:

ف۔ان حروف کے معانی سے عام لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بتلادیا گیا ہو، کیوں کہ اللہ اور رسول نے اہتمام کے ساتھ وہی باتیں بتلائی ہیں جن کے نہ جاننے سے کوئی حرج دین میں واقع ہوتاہو اور ان کے نہ جاننے سے کوئی حرج نہ تھا۔اس لیے ہم کو بھی ایسے امور کی تفتیش نہ چاہیئے۔[16]

ایسے ہی سورۃالانبیاء آیت ۴۷ کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئا وان کان مثقال حبۃ من خردل اتینا بھا وکفیٰ بنا حاسبین

ترجمہ:اور قیامت کے روز ہم میزانِ عدل قائم کریں گے، سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا۔اگر عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا، تو ہم اس کو حاضر کردیں گے۔اور ہم حساب لینے کے لئے کافی ہیں۔

**تفسیر:ربط:** شروع سورہ میں انکارِ رسالت پر تشنیع تھی اور اس کے سیاق وسباق میں اس پر استحقاق وعید عذاب سے تفریع تھی،آگے بھی دوسرے عنوان سے یہی مضمون ہے۔کفیٰ بنا حاسبین تک ترجمہ سے ظاہر ہوگا۔[17]

سورۃالناس کا اختتام اس انداز سے کیا گیا ہے:

مراد اس سے وہ وسوسہ ہے، جو مفضی الی المعصیۃ ہو جائے اور اس کا مضرت دینیہ ہونا ظاہر ہے،اور ایک عجیب لطیفہ اس صورت میں، جس سے قرآن کا حسن آغاز وانجام بھی ظاہر ہوتا ہے، یہ کہ اس کے اور فاتحہ کے مضامین میں غایت درجہ کا تقارب کہ حکم اتحاد میں ہے، متحقق ہے۔چنانچہ رب الناس کے مناسب۔[18]

مولانا سید عبد الشکور ترمذیؒ نے بیان القرآن کے خاتمے کو کافی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور مولانا تھانوی کے ان نکاتِ انیقہ کو نقل کیا ہے:

اور ایک عجیب لطیفہ اس سورت میں جس سے قرآن کا حسن آغاز وانجام بھی ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ اس کے اور فاتحہ کے مضامین میں غایت درجے کا تقارب کہ حکم اتحاد میں ہے متحقق ہے، چنانچہ

---

[15] بیان القرآن جلد اول ص ۴

[16] ماخذ سابق ص ۴

[17] ماخذ سابق ص ۴۸۴

[18] بیان القرآن جلد سوم ص ۶۷۴

رب الناس کے مناسب رب العالمین اور ملک الناس کے مناسب مالک یوم الدین اور الٰہ الناس کے مناسب ایاک نعبد اور استعاذہ کے مناسب ایاک نستعین اور الوسواس الخناس الخ کے مناسب اھدنا الخ ہے۔[۱۹]

اسی طرح اس پوری سورہ کی تفسیر کا اندازِ تحریر ہے۔اس کے بعد مسائل السلوک ذیلی عنوان قائم کر کے تزکیۂ نفس کے مختلف مراحل پر گفتگو کی گئی ہے ۔اس کے بعد مثلاً اللغات ،النحو ،البلاغۃ ،اختلاف القرأۃ،الروایات،اور حاشیہ جیسے چند عناوین قائم کر کے اس کے تحت تشریح کی گئی ہے۔

بیان القرآن چند ممتاز اہل علم کی نظر میں:

علامہ انور شاہ کشمیریؒ: ''۔۔۔اردو کتابوں میں علوم نہیں ہیں،اس لئے میں کسی کی اردو تصانیف کو دیکھنا بے کار سمجھتا تھا، لیکن جیسے ہی بیان القرآن دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوا کہ اردو تصنیف میں بھی اب علوم موجود ہیں''۔[۲۰]

**مولانا سید سلیمان ندویؒ:** ''مولانا نے اپنی تفسیر میں روایات صحیحہ اور اقوالِ سلف صالحین کا التزام کیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کو حل کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گیے ہیں۔ تمام کتب تفاسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ یہ تفسیر تیرہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے ،اس لیے تمام قدماء کی تفسیر کا خلاصہ ہے اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا مل جاتی ہیں'' ۔[۲۱]

**مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ:** ''مولانا کی تفسیر جامع ہے، جو علمائے سلف کے تفسیری اقوال اور متقدمین کی تفاسیر کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کے عقائد ورسوم کی اصلاح پر بھی مولانا نے اس میں زور دیا ہے۔آیات کی باہمی مناسبت اور ربط سور کا ذکر بھی اختصار سے کیا ہے۔ قواعد صرف و نحو بھی تحریر کیے ہیں اور جا بہ جا سلوک و تصوف کے مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ ترجمہ تحت اللفظ ہونے کے باوجود سلیس اور عام فہم کیا ہے۔ تفسیر میں بھی تفہیم کا انداز اچھا اور مؤثر ہے۔ عبارت ما قل و مادل کا نمونہ،

---

[۱۹] ماخذ سابق ص ۱۸

[۲۰] بحوالہ ماہنامہ شاہراہ علم اکل کوا، اپریل ۲۰۱۹ء ص ۱۳۷ الکلام الحسن ص ۳۹۲

[۲۱] مولانا ضیاء الدین اصلاحی ،اردو تفاسیر کا ایک جائزہ ،ششماہی علوم القرآن علی گڈھ جولائی ۔دسمبر ۲۰۰۶۔ ص ۶۳

جامع، مربوط، رواں اور حشو و زواید سے پاک ہے''۔[۲۲]

**مفتی محمد شفیعؒ:** ''اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان کی تفاسیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ تو قطعاً کوئی مبالغہ نہیں، اس تفسیر کی پوری قدر و قیمت تو وہ علماء ہی جان سکتے ہیں۔ جنہوں نے تفسیر قرآن کے پورے ذخیرے کو چھانا ہو اور مشکل مقامات پر مختلف مفسرین کی تفسیریں پیش نظر ہوں کیوں کہ وہ یہ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے اشکالات کو دو دو چار لفظوں میں حل کر دیا گیا ہے''۔[۲۳]

**مولانا عبد الماجد دریابادیؒ:** ''بیان القرآن (پارۂ اول میں دو مقامات مجھے بالکل بے نظیر نظر آئے۔ ایک تخلیقِ آدم کے موقع پر فرشتوں کی گفتگو، دوسرے تعلیم سحر ہاروت وماروت کی زبان سے۔ دونوں مقامات بڑی الجھن کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم میں انہیں ایسا سلجھادیا کہ اب کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا''۔[۲۴]

مندرجہ بالا آراء سے مولانا تھانویؒ کی تفسیر کی اہم خصوصیات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس سے ان کے کمال حزم واحتیاط برتنے کا سلیقہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنی تفسیر میں عقل کے بجائے نقل پر اعتماد کیا ہے۔ قرآن مجید میں یہودیوں کے متعلق سور و بندر بنانے کا جو ذکر ہے، اسے مولانا تھانویؒ مجازی نہیں بلکہ حقیقت پر محمول کرتے ہیں جب کہ عقلی تفسیر کرنے والے مفسرین اسے مجاز پر محمول کرتے ہیں۔ مولانا تھانویؒ سے جب مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے اس کے متعلق ایک استفسار کیا تو اس پر انہوں نے سخت انقباض اور بیزاری کا اظہار کیا، اور جواباً کہا:

> ایسے اقوال تو ہر واقعے میں ملیں گے! تو کیا ایسے اقوال سے ان صحیح و مسلم اور عقلی قواعد کو مثلاً النصوص تحمل علی ظہورھا، اور مثلاً الناطق یقضی علی الساکت، اور علاوہ ان قواعد کے خود الفاظ قرآن اس تاویل کو مستبعد بتلا رہے ہیں۔۔۔۔[۲۵]

ایسے ہی ایک دوسرے مقام پر اس تفسیر کی اہمیت کے متعلق مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں:

> اس عاجز نے اپنے لیے دلیلِ راہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمے کو بنایا، جو ان کی تفسیر بیان القرآن کے ساتھ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں اول بار شائع ہوا۔ اپنی خصوصیات کے لحاظ

---

[۲۲] ماخذ سابق، ص ۶۱

[۲۳] علمائے ہند کی اہم قرآنی خدمات، (مجموعہ مقالات) المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۸

[۲۴] مولانا عبد الماجد دریابادی، حکیم الامت نقوش وتاثرات، دار المصنفین، ۲۰۱۱ء ص ۳۴۷

[۲۵] ماخذ سابق، ص ۵۲۹

سے بس اپنا نظیر آپ ہی ہے، اسے اگر اردو کی ساری تفسیروں کا سرتاج سمجھا جائے، تو شاید مبالغہ نہ ہو۔[۲۶]

**مفتی محمد حسن امرت سریؒ:** "۔۔۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا بیان القرآن کی سرخیوں میں علوم القرآن ہیں۔ ان کے اندر غور کرنے سے قرآن کے علوم کا اور غرض مسوق لہ الکلام (جس غرض کے لیے گفتگو لائی گئی ہے) کا پتہ چل جاتا ہے"۔[۲۷]

**مولانا یحیٰ کاندھلویؒ:** (اپنے شاگرد مولانا عبد اللہؒ سے کہا) "ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں بھی تفسیر آتی ہے۔ لیکن بیان القرآن دیکھ کر معلوم ہوا کہ ہمیں کچھ بھی تفسیر نہیں آتی"۔[۲۸]

مولانا تھانویؒ خود اپنی تفسیر کو ایک الہامی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ علمائے دیوبند کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اس کی بڑی تحسین کی ہے۔ یہ تفسیر تفسیر ماجدی، معارف القرآن از مفتی شفیعؒ وغیرہ کا ایک بڑا ماخذ بھی ہے۔

**مولانا برہان الدین سنبھلیؒ:**[۲۹] حضرت کی تفسیر و ترجمہ کی خصوصیات و نافعیت کا احاطہ، کسی مضمون میں ہی نہیں؛ بلکہ کتاب میں بھی مشکل ہے کہ: سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیے۔[۳۰]

**مراجع و مصادر بیان القرآن:** مولانا تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن کی تیاری میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کا جاننا مفید معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے درج ذیل اہم کتب سے استفادہ کیا ہے وہ یہ ہیں:

تفسیر بیضاوی، تفسیر جلالین، تفسیر رحمانی، اتقان فی علوم القرآن، معالم التنزیل، روح المعانی، مدارک، خازن، تفسیر فتح المنان، تفسیر حقانی، تفسیر ابن کثیر، لباب النقول، در منثور، تفسیر کشاف، اور قاموس وغیرہ۔ ان کے علاوہ احادیث میں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابو داؤد،

---

[۲۶] عبد الماجد دریابادی، تفسیر ماجدی جلد اول، صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ ۲۰۰۸ء۔ ص ۱۰

[۲۷] بحوالہ ماہنامہ شاہراہ علم، اکل کوا، اپریل ۲۰۱۹ ص ۷ ۱۳ الکلام الحسن ص ۳۹۲

[۲۸] ماخذ سابق ص ۳۵

[۲۹] مولانا برہان الدین سنبھلیؒ نے مولانا تھانویؒ کی تفسیر پر ایک مقالہ لکھا تھا، جو علمائے ہند کی اہم قرآنی خدمات، نامی کتاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی ہے، جو اصلاً سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔

[۳۰] علمائے ہند کی اہم قرآنی خدمات، ص ۱۳۸

نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، الجامع الصغیر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ان کے علاوہ بعض اہم دیگر کتابیں مثلاً صدرا، در مختار، تبیان [۳۱]، شرح العوامل وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔

## تبصرہ و تجزیہ

۱۔ یہ تفسیر اردو کی اولین تفسیروں میں شامل ہے اور اسے اردو تفسیروں میں ایک خاص مرجع کی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ یہ تفسیر پہلے بارہ جلدوں میں شائع ہوتی تھی۔اب ان ساری جلدوں کو فقط تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

۳۔ اس کے آخر میں جو علوم القرآن پر مشتمل رسائل منسلک ہیں، ان کے ترجمے کی ضرورت ہے۔ مثلاً وجوہ المثانی، مسائل السلوک من کلام ملک الملوک وغیرہ۔

۴۔ مذکورہ عربی رسائل کی کتابت اتنی باریک ہے کہ پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

۵۔ ان تین جلدوں کی فہرست کو منطقی ترتیب سے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً جلد اول کی فہرست تو شروع میں دی گئی ہے مگر جلد دوم و سوم کی فہرست آخر میں دی گئی ہے۔



[۳۱] یہاں پر ڈاکٹر ریحانہ ضیاء صدیقی (علیگ) نے یہ تبصرہ کیا ہے: "یہ مولانا تھانویؒ کا ایک مختصر مجموعہ بعض ان تقریرات کا ہے، جو ان کے ہمشیرہ زاد مولوی سعید احمد مرحوم نے تفسیر کے مختلف مقامات ان سے پڑھتے وقت ضبط تحریر کرلی تھیں، مگر سعید صاحب کی وفات ہونے کی وجہ سے اس کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی" (بحوالہ حاشیہ بیان القرآن جلد اول۔ ص ۱)۔

# مثنوی ''زیر و بم'' میں فکر رومی کی عکاسی

**مبشر اعجاز**

ریسرچ اسکالر، پوروانچل یونیورسٹی، جونپور

ajazmobashshir@gmail.com

اسلامیان ہند کی علمی اور فکری روایات کی تعمیر و تشکیل میں تصوف کا اہم کردار رہا ہے۔ سیاسی زوال کے ساتھ شروع ہوئی ذہنی خلش کی تشنہ کامی کے لئے صوفیہ کی خانقاہیں آب حیات سے کم نہیں تھیں۔ جب ،جب پر آشوب دور آئے ہیں تو دنیا کے زیر و زبر سے تنگ آکر عوام کی ایک جمیعت نے ان خانقاہوں میں ہی پناہ لی ہے کیونکہ روح و قلب کی تطہیر کا سامان اور زخم دل کا مداوا جس طرح یہاں میسر ہوا اس طرح کی دست یابی کہیں اور ممکن نہ تھی۔ ساتویں صدی ہجری میں جب عالم اسلام فتنۂ تاتار سے ٹوٹ کر بکھر رہا تھا اور مسلم دنیا زبردست ذہنی انتشار کا شکار ہو چلی تھی، ایسے میں تصوف کے افق پر مولانا جلال الدین رومی کی ذات مجددانہ شان کے ساتھ ابھری۔ ایک عہد ساز اور عہد آفریں مرد کامل کی حیثیت سے مولانا روم نے جو نقوش چھوڑے تھے، وہ آج بھی وہی آب وتاب کی شان رکھتے ہیں۔ مولانا کی سب سے اہم شاہکار اور شہرہ آفاق یادگار ''مثنوی معنوی'' ہے، جو چھ بسیط دفاتر اور تقریبا ۲۶ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں اخلاق، عقائد اور الٰہیات کے سارے موضوعات نہایت ہی دلکش انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی صوفیہ کا ایک بڑا حلقہ اسے حرز جاں بنا کر سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اس کی مقبولیت اور شہرت جغرافیائی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے مغرب کو بھی اپنا گرویدہ بنا چکی ہے۔ عوام و خواص میں اس کی اسی مقبولیت نے ہی تراجم و تشریحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا شبلی نے بھی اپنی تصنیف ''سوانح مولانا روم'' میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ہندوستان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ''کلید مثنوی'' کے نام سے ۲۴ جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم اور مفصل شرح لکھی۔ مولانا تھانوی ایام طالب علمی ہی میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہو گئے تھے۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا کی ذہنی و فکری تربیت حضرت حاجی صاحب کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی۔ حاجی صاحب کو مثنوی سے خاص لگاؤ تھا۔ ان ہی کے زیر اثر مولانا تھانوی کو بھی مثنوی سے تعلق ہو گیا۔ طالب علمی کے دوران مولانا جب دیوبند میں مقیم

تھے، محض اٹھارہ سال کی عمر میں فارسی زبان میں تصوف کے اسرار و رموز سے لبریز مثنوی ''زیر و بم'' لکھ ڈالی۔ مثنوی کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

اشرف علی غفرالغفار ذنوبہ وسترالستار عیوبہ کہ این نالہ ہائے چند برانگیختم از سوز نہانی و ایں سوز ہابیروں افگندم از درد پنہانی ہر چہ درد لم ریختند ریختم و بیختند بیختم نہ از قافیہ آگاہم نہ از ردیف اطلاعم نہ از روی خبرے نہ از وزن بنائے نہ عروض دانم نہ تقطیع خوانم نہ اعتراضے برمن رود سوالے برمن شود کہ مدعی نیم اعتراف بقصورمی کنم نہ مایہ دارم نہ بضاعتے نہ سودے نہ تجارتے از بے زر آید چہ ساز و از بے پرچہ پرواز پروبال شکستہ ام و از بند اعتراض و جوابر ستہ ام[1]

(اشرف علی! مغفرت کرنے والی ذات گناہوں کو بخش دے، عیوب کی پردہ پوشی کرنے والی ذات عیوب کی پردہ پوشی کرے۔ کہ یہ چند فریاد جو اندرون کے سوز کے ساتھ نکلے ہیں، دل میں پوشیدہ درد کا، جو دل میں اٹھتا ہے، اظہار کیا ہے۔ میں قافیہ بندی سے آگاہ نہیں ہوں اور نہ ردیف کی کوئی جانکاری ہے، اور نہ ہی عروض کا علم ہے، اور نہ ہی اشعار کی تقطیع کرنا جانتا ہوں۔ اس لئے میرے اشعار پر کوئی اعتراض نہ ہو اور نہ سوال اٹھے۔ میں قصور کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پاس کوئی پونجی نہیں ہے اور نہ کوئی بضاعت۔ نہ تجارت ہے اور نہ ہی نفع۔ ایک غریب کی کوئی ساز نہیں ہوتی، جس طرح بے پر کوئی پرواز نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے بال و پر توڑ لیا ہے اور میں اعتراض و جواب سے آزاد ہوں)۔

مولانا تھانوی نے یہاں شعر اور شعر گوئی سے جس طرح ناواقفیت کا اظہار کیا ہے وہ دراصل ان کی خاکساری اور وسیع القلبی ہے۔ کیونکہ مولانا کے حالات زندگی کے مطالعے سے اس راز کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا شاعری کا عمدہ اور لطیف ذوق رکھتے تھے۔ مولانا کا یہ ذوق شعری ان کے ملفوظات میں بکھرا ہوا ہے۔ جگر مرادآبادی جب رندی اور مے کشی کے دور سے گزر رہے تھے، مولانا کو فارسی کا یہ شعر لکھ بھیجا:

بہ سر تو ساقی مست من آید سرور بے طلبی خوشم
اگرم شراب نمی دہد بہ خمار تشنہ لبی خوشم

(ساقی تیرے دل میں یہ بات ہے کہ تجھ سے کچھ نہ مانگوں، تو ٹھیک ہے۔ اگر تو مجھے شراب نہیں دیتا تو نہ دے۔ میں اسی تشنہ لبی کے خمار سے خوش ہوں)۔

مولانا نے جگر کے بھیجے ہوئے شعر کا جواب فارسی زبان میں شعر ہی کے ذریعے دیا:

---

[1] تھانوی اشرف علی، مثنوی زیر و بم، کتب خانہ اشرفیہ جامع مسجد دہلی، ۱۹۵۴ء، ص ۱۲

نہ بہ نثر نا تو بے بدل، نہ نظم شاعر خوش غزل
بہ غلامئی شہ عزوجل و بہ عاشقی نبی خوشم

(نہ کسی ادیب کی تحریر میں دل لگتاہے اورنہ ہی کسی بڑے شاعر کی شاعری سے خوشی ہوتی ہے،میں توبس اللہ کی بندگی اورپیارے نبی کی غلامی سے خوش ہوں)۔[۲]

مولاناتھانوی نے اپنی مثنوی کوپایہ تکمیل تک پہنچالینے کے بعداپنے آپ کوشعری شعور سے عاری اور شعروشاعری سے جس طرح لاتعلقی کااظہار کیاہے،وہ محض انکسار ہے۔ مولانا صلاح الدین نے ''تصورات اقبال''میں مولانا روم کی شاعری کے متعلق اس طرح تبصرہ کیاہے:

مولاناجلال الدین بنیادی طورپر شاعر نہیں تھے بلکہ ایک مرد مومن تھے جنہیں علم و فکر ذوق و شوق سوز و خلوص اور کلام وبیان کی خزائن عامرہ میں ایک نہزہ عظیم عطاکیا گیاتھا،خوداپنی زندگی کوان مقاصد عالیہ اوران اقدار جلیلہ سے ہم آہنگ کرتے ہوئے توفیق بھی ارزاں ہوئی تھی[۳]

لیکن یہی تحریر مولانا تھانوی پر بھی حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اظہار خیال و ترسیل افکار کے لیے شعر و شاعری کا جو پاکیزہ ذوق دیکھنے کو ملتاہے، وہ بھی مولانا رومی کا ہی تتبع ہے۔ مولانا کی ذات اپنے عہد میں نہ صرف ایک علمی، روحانی اور تربیتی ادارہ بن چکی تھی بلکہ اصلاح وتربیت کی ایک ایسی دانش گاہ تھی، جہاں مسلمانوں کی ذہنی و فکری بلکہ ارتدادی امراض کی نہ صرف تشخیص ہوتی تھی، بلکہ اس کا مداوا بھی ملتا تھا۔ مولانا کو اصلاح اور تربیت کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آتے تھے۔

مولانا نے مثنوی معنوی کے مفاہیم کو مثنوی زیر و بم میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمیٹ لیاہے، مثنوی میں محاسن شعری سے اغماض اور عبارت آرائی سے گریزہے۔احوال ومقامات صوفیہ اور مباحث سلوک سادہ اور سلیس زبان میں بیان ہوئے ہیں ۔ مثنوی کا نام ''زیر و بم'' مثنوی معنوی مولوی کے ایک شعر سے ماخوذ ہے، جس کی صراحت مولانا نے سرِورق پر کردی ہے۔ شعر یہ ہے:

سر پنہاں است اندر زیروبم فاش گر بگویم جہاں برہم زنم

(زیر و بم یعنی اتار چڑھاؤ میں راز پوشیدہ ہیں۔
اگر میں اس راز کو فاش کردوں تو دنیامیں انتشار پیدا ہو جائے گا)۔

---

[۲] ماہنامہ الابرار، کراچی، ربیع الثانی ۱۴۳۸ ہجری ص ۳۶
[۳] صلاح الدین مولانا، تصورات اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ ۱۹۷۴، ص ۳۲۷

مولانا تھانوی نے اس شعر کی تشریح ''کلید مثنوی'' میں یوں کی ہے۔

زیر باریک آواز کو کہتے ہیں اور بم بلند آواز کو اور دو باب بھی اسی کو کہا ہے۔ مراد اس سے مضامین رنگارنگ مختلف ہیں۔ مطلب یہ کہ عشاق اپنے کلمات عشقیہ میں جو کچھ اجمالاً کہہ رہے ہیں اس کے راز اور حقیقت کو اگر ظاہر اور مفصل کر کے کہہ دوں تو عالم تباہ ہو جائے۔ وہ راز وحدت الوجود کا ہے کہ کلام عشاق کا تمام تر حاصل وہی ہے ماسوا اللہ تعالی کے وجود کالعدم ہے اور موجود حقیقی وہی ایک محبوب اعظم ہے۔[۴]

کتب خانہ اشرفیہ جامع مسجد دہلی سے طبع مثنوی ''زیروبم'' کے ایک بوسیدہ نسخہ کا زیروکس انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ جس کا منظوم اردو ترجمہ ''ترانہ غم'' کے نام سے جناب قاضی عبدالصمد نے کیا ہے۔ ''زیروبم'' کی اصطلاح کو مولانا روم نے مثنوی کے کئی اشعار میں استعمال کیا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار پیش ہیں۔

مس خود را بر طریق زیر و بم تا ابد بر کیمیا اش می زنم
خرچ کر دم عمر خود را دم بدم دردمیدم جملہ را در زیر و بم
کے بود آواز چنگ از زیر و بم از برائے گوش بے حس اصم
عطار روح بود و سنائی دو چشم مااز پے سنائی و عطار آمدیم

(میں اپنے تانبے کو زیروبم کے ذریعے، ابد تک کے واسطے اس کی اکسیر پر مل رہا ہوں میں نے اپنی عمر کو لگاتار خرچ کیا ہے۔۔ جملے کے زیروبم کو چمکانے میں چنگ کے زیروبم کی آواز سے کیا ہوتا ہے ایک بے حس بہرے کے کان پر عطار کی حیثیت روح کی تھی اور سنائی کی حیثیت دو آنکھوں کی۔ میں عطار اور سنائی کی پیروی کرتے ہوئے آیا ہوں)۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ مولانا روم نے اپنے مرید خاص حسام الدین چلپی کی خواہش پر مثنوی لکھی تھی۔ لیکن جب اس کا آغاز کیا تو حکیم سنائی کی ''حدیقہ'' اور شیخ فریدالدین عطار کی ''منطق الطیر'' زیر نظر تھی۔ جس کا اعتراف مولانا روم نے بذات خود کیا ہے:

تاریخ کے اوراق میں اس امر کی شہادت موجود ہے کہ خواجہ عطار کی تصنیفات مولانا کے لئے دلیل راہ بنی تھیں۔ مولانا روم جب اپنے والد محترم کے ساتھ نیشاپور پہنچے تھے تو خواجہ عطار نے اپنی کتاب ''اسرارنامہ'' ہدیۃً دی تھی۔ اس تعلق سے مولانا شبلی کی رائے بڑی ہی موزون ہے:

---

[۴] تھانوی اشرف علی، کلید مثنوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان محرم الحرام سن ۱۴۲۶ھ، ص۹

مثنوی نے وہ شہرت حاصل کی کہ آج ''حدیقہ'' اور ''منطق الطیر'' کے اشعار مشکل سے ایک آدھ آدمی کی زباں پر ہوں گے، بر خلاف اس کے مثنوی کے اشعار بچے بچے کی زبان پر ہیں اور واعظوں کی گرمیٔ محفل تو بالکل مثنوی کے صدقے سے ہے۔[۵]

جس طرح مثنوی کے وجود میں آنے کا اصل محرک یہ دونوں مثنویاں بنی تھیں، بعینہ یہی حال مولانا تھانوی کا بھی ہے۔ان کی مثنوی ''زیر و بم'' کی اساس مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی پر ہے۔ اس کی شہادت مثنوی زیر و بم کے صفحہ ۲۳ پر درج مولانا روم کے اس شعر سے ہوتی ہے، جسے مولانا تھانوی نے من و عن نقل کیا ہے:

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

(بہتر یہی ہے کہ دلبروں کا راز۔ دوسروں کی زبان سے ادا ہو)۔

مثنوی معنوی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ مولانا روم نے مثنوی کا آغاز حسب دستور حمد و نعت سے نہ کرتے ہوئے ذیل کی شعر سے کیا ہے:

بشنواز نے چوں حکایت می کند از جدائیہا شکایت می کند

(بانسری کی آواز کو سنو، کہ وہ کیا داستان بیان کر رہی ہے۔

دراصل وہ درخت (اپنے وجود) سے جدا ہونے کی شکایت کر رہی ہے۔)

اسی لئے بعض ظاہر بین اور تصوف کے اسرار و رموز سے ناآشنا افراد کو شکایت ہے کہ زبان پہلوی کا یہ کیسا قرآن ہے کہ جس کا آغاز اسمائے باری تعالیٰ سے نہ ہو کر بانسری کی صدا یعنی موسیقی سے ہو رہا ہے۔ مولانا تھانوی شرح لکھتے وقت اس نوع کے اعتراضات سے بخوبی واقف تھے، اسی لئے اس اعتراض کو نظر انداز نہ کر سکے بلکہ دفاع کے لئے اپنا زور قلم صرف کر دیا:

یہ سوال تو نہایت ہی بے کار ہے کہ شروع میں حمد و نعت کیوں نہیں لکھی کیونکہ ان چیزوں سے ابتدا کرنا کچھ لکھنے میں منحصر نہیں بلکہ زبان سے کہہ لینا کافی ہے۔ یہ صرف کھانے پینے کے قبل زبان سے بسم اللہ کہی جاتی ہے، کوئی لکھنا لکھانا نہیں۔[۶]

مولانا روم کی ''مثنوی معنوی'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم مولانا تھانوی کی مثنوی ''زیر و بم'' کا مطالعہ کرتے ہیں، تو مختلف مقامات پر دونوں مثنویوں کے اشعار میں عجیب مماثلت اور یکسانیت دیکھنے

---

[۵] مولانا شبلی نعمانی، سوانح مولانا روم، نامی پریس کانپور، ص ۵۲

[۶] تھانوی، اشرف علی، کلید مثنوی، ادارۂ تالیفات اشرفیہ، ملتان، محرم الحرام سنہ ۱۴۲۶ھ ص ۲

کو ملتی ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اہل تصوف کی تعلیمات اس راز سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ ظاہری اور باطنی تمام علم انسانوں کے اپنے باطن میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ انسان کو اپنے باطن کی تلاش پر زور دیتے ہیں۔ مولانا رومی نے ذیل کے اشعار میں انسان کو اپنی اصل یعنی باطن کی طرف توجہ دلائی ہے:

اے نسخہ نامہ الٰہی کہ توئی دی آئینہ جمال شاہی کہ توئی
بیرون زتو نیست ہر چہ در عالم است در خود بطلب ہر آنچہ خواہی کہ توئی

(کیا تم نہیں جانتے کہ خدا کے پیغام کا اصل نسخہ تم ہی ہو۔ تم ہی وہ آئینہ ہو جس میں شاہ کا جمال اور صفات نظر آتی ہیں۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے، تمہارے اندر بھی موجود ہے۔ اپنے اندر جھانکو، تم جس کے متلاشی ہو وہ تمہارے اندر ہی مل جائے گا)۔

مولانا تھانوی نے اپنی مثنوی کا آغاز حمد و ثنا سے کیا ہے۔ انھوں نے حمد و ثنا کے اشعار میں تصوف اور فلسفے کی آمیزش نہایت خوبصورتی سے کی ہے۔ ان کی حمد میں روحانیت اور علمیت یکجا ہو گئے ہیں۔ مولانا نے اپنی مثنوی کے دوسرے اور دسویں شعر میں مولانا روم کے ہی طرز پر ''توئی'' کا قافیہ باندھا ہے:

اے ہمہ عشاق را مطلب توئی طالباں را ملت و مذہب توئی
عابداں را لائق اطاعت توئی عاصیاں را واسع الرحمۃ توئی

(سبھی عاشقوں کا مطلب تیری ہی ذات ہے۔ چاہنے والوں کی ملت و مذہب بھی تیری ہی ذات ہے۔ عبادت گزاروں کے لئے تیری ذات لائق اطاعت ہے۔ گنہگاروں کے لئے تیری ہی ذات واسع الرحمۃ ہے۔)

مولانا روم نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک چرواہے کو دیکھا کہ وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے: اے خدا تو کہاں ہے؟ اگر تو ملتا تو میں تیرے بالوں میں کنگھی کرتا، جوئیں نکالتا، تجھ کو مزے، مزے کے کھانے کھلاتا۔ مولانا رومی نے اس داستان کو اس طرح قلم بند کیا ہے:

تو کجائی تا شوم من چا کرت چارقت دوزم کنم شانہ سرت
جامہ ات شویم شپشہایت کشم شیر پیشت آورم اے محتشم
دستکت بوسم بمالیم پایکت وقت خواب آید بروبم جائیکت

(تو کہاں ہے تا کہ تجھے پا کر میں تیری چاکری کروں۔ تیرے کپڑے سلوں اور تیرے سر کے بالوں کا کنگھا کروں۔ تیرے کپڑے دھلوں اور تیرے بالوں کے جوؤں کو ماروں۔ اے قابل احترام! تجھے پینے کے لئے دودھ لاؤں۔ میں تیرے ہاتھ کو بوسہ دوں اور تیرے پیر کی مالش کروں۔ جب تو سونے کو جائے تو اس جگہ پر جھاڑو لگاؤں۔)

مثنوی میں دوسری جگہ بھی تلاش و جستجو کا یہی انداز ہے:

تو کجائی تاکہ خندان چوں چمن گوئی بستاں آن و دہ چنداں زمن
تو کجائی تا مرا خندان کنی لطف و احساں چوں خداونداں کنی
تو کجائی تا بری در مخزنم تا کنی ازدام و فاقہ آمنم

(تو کہاں ہے تا کہ تجھے پا کر چمن کی طرح کھل اٹھوں۔ تو بھی مجھے بوستان کہہ دے، اور کہے تو مجھ سے دس گنا بہتر ہے۔ تو کہاں ہے تا کہ تو مجھے ہنسا دے۔ خداوند قدوس کی طرح مجھ پر لطف واحسان کرے۔ تو کہاں ہے تا کہ تو مجھے اپنے خزانے میں چھپالے۔
تا کہ تو مجھے قید وفاقہ کی مصیبت سے محفوظ کرلے۔)

مولانا تھانوی نے مثنوی ''زیر و بم'' میں ''فغان شہزادہ'' کے عنوان سے چند شعر قلم بند کیے ہیں جب کہ شہزادہ اپنی دلربا کو نہ پا کر اسے دیوانہ وار تلاش کرتا ہے۔ تلاش و جستجو کا یہی انداز مثنوی زیر و بم میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ''تو کجایی'' کی تکرار شعری مثنوی معنوی کی ہی صدائے باز گشت لگتی ہے:

تو کجائی اے انیس قلب من تو کجایی یارمن نازک بدن
تو کجایی اے شہ رشک قمر تو کجائی اے مہ نیکو سیر
تو کجایی سر گروہ دلبران تو کجایی غیرت ناز ک تناں
تو کجائی اے بقامت ہمچو سرو تو کجائی اے بچالش چوں قدرو
تو کجایی اے بت طناز من تو کجایی ای صنم پر ناز من

(اے میرے دل کے دوست تو کہاں ہے۔ اے میرے نازک بدن دوست تو کہاں ہے۔ اے چاند کے لئے باعث رشک بادشاہ تو کہاں ہے۔ اے نیک سیرت چاند تو کہاں ہے۔ اے دلبروں کے گروہ کے سردار تو کہاں ہے۔ اے نازک بدن والوں کے لئے باعث غیرت تو کہاں ہے۔ اے وہ جو قد میں سرو کے مانند ہیں، کہاں ہیں۔ اے وہ جو چال میں کلک کے مانند ہیں، کہاں ہیں۔ اے میرے شوخ محبوب تو کہاں ہے۔ اے ناز و ادا سے بھرپور محبوب تو کہاں ہے۔)

پاکیزہ معاشرتی ماحول میں ہی کسی فرد کے ظاہر و باطن کی اصلاح ممکن ہے۔ کردار سازی کے لئے صالح معاشرہ وصالح افراد کی صحبت کو مولانا روم نے نہ صرف ضروری قرار دیا ہے بلکہ بری صحبت سے اجتناب کی ترغیب بھی دی ہے:

دور شو از اختلاط یار بد یار بد بدتر از مار بد

(برے دوست سے ملنے جلنے سے پرہیز کر۔ کیونکہ برا دوست برے سانپ سے بھی بدتر ہے۔)

اصلاح معاشرہ کے لئے مولانا تھانوی بھی مولانا روم کے ذریعے آزمودہ نسخہ ہی تجویز کرتے ہیں:

کن گریز از خفتگان ایں جہاں فیض یاب از صحبت صاحب دلاں
گیر صحبت نیک و بد را ترک کن صحبت وتاثیر اورا درک کن

(اس دنیا کے سوئے ہوئے لوگوں سے پرہیز کر۔ بلکہ صاحب دل لوگوں سے فیض حاصل کر۔ اچھی صحبت اختیار کر اور بڑی صحبت کو چھوڑ دے۔ ان کی صحبت اور صحبت کے اثرات کی سمجھ پیدا کر۔

اصلاح معاشرہ کے عنوان سے مولانا روم کا ذیل کا شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے:

صالح ترا صالح کند صحبت صحبت طالح تراطالح کند

(نیک لوگوں کی صحبت تجھے نیک بنائیگی۔ برے لوگوں کی صحبت تجھے برا بنائے گی۔)

مولانا تھانوی نے مثنوی معنوی کے اس شعر کو اپنی مثنوی میں ردوبدل کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ دونوں اشعار کی ساخت میں ایک طرح کی یکسانیت جھلک رہی ہے:

صحبت خفتہ تراخفتہ کند قلب مجموع تو آ شفتہ کند

(سوئے ہوئے لوگوں کی صحبت تجھے سونے والا بنائیگی۔ تیری دلجمعی کو بکھیر دے گی)۔

مولانا روم نے اولیا کی صحبت میں رہ کر ظاہر و باطن کی اصلاح کرنے کو ہزار سال کی عبادت سے بہتر قرار دیا ہے۔

''صحبتے با اولیا'' کا یہ تصور اہل تصوف کے مابین اس قدر مقبول ہوا کہ بعض اکابرین تصوف کے ملفوظات کا عنوان بن گیا:

یک زمانہ صحبتے با اولیا بہتر از صد سالہ طاعتے بے ریا

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کی تھوڑی سی صحبت، سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔)

''صحبتے با اولیا'' کی طرز پر مولانا تھانوی نے ''صحبتے با خفتگان'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مولانا تھانوی لکھتے ہیں:

خفتہ ہستند ایں ہمہ اہل جہاں تانگیری صحبتے با خفتگان

(یہ تمام دنیا والے سوئے ہوئے ہیں۔
اس لئے تم بھی سوئے ہوئے لوگوں کی صحبت مت اختیار کرو۔)

دنیا مادی صورت میں مال و متاع، دختر و فرزند اور سیم و زر کے ساتھ انتہائی پرکشش نظر آتی ہے۔ انہی عناصر سے حرص و طمع کو فروغ ملتا ہے اور قلب انسانی دنیا کی رنگینیوں میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو بھی بھول جاتا ہے۔ رومی کہتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ میزان وزن

(دنیا کیا ہے؟ خدا کی یاد سے غافل ہونا ہی دنیا ہے۔

صرف گھر کے ساز و سامان، مال و دولت کا اکٹھا کرنا ہی نہیں ہے۔)

مولانا تھانوی اسی موضوع کو اپنی مثنوی ''زیر و بم'' میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

کار دنیا چیست باطل سربسر خاک افگن برسرایں سیم و زر
از خدا غافل کند ایں سیم و زر ترک کن دنیا و ما فیہا پسر

(دنیا کا کام کیا ہے؟ دنیا کا کام سراسر باطل ہے۔ اس دنیا کی مال و دولت پر تو خاک ڈال دے۔ کیوں کہ یہ مال و دولت خدا کی یاد سے غافل کرتی ہے۔ اے میرے بیٹے دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اسے چھوڑ دے۔)

مولانا روم کا ایک اہم موضوع عشق حقیقی ہے۔ مولانا کے نزدیک عشق کا مطمع باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ عشق مالک حقیقی کے ساتھ مخصوص ہو۔ بلکہ یہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، حتّٰی کہ مادی اشیا، نظریہ، عقیدہ یا کسی مشن سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو اندر سے انسان کو متحرک کرتا ہے۔ عشق ایک ایسا عزم بالجزم ہے جو انسان کے اندر کام کرنے کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ اس میں انسانوں کے خوابیدہ صلاحیتوں کو جگانے کی صلاحیت ہے۔ عشق کی ہی بدولت انسان روحانیت کے مراحل طے کر کے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے۔ عشق ہی عزم مصمم میں تبدیل ہو کر بڑی سے بڑی مہمات کو سرانجام دیتا ہے۔ جس روح کے اندر عشق کی گرمی نہیں اس ہستی سے نیستی بہتر ہے۔ یہی نالہ فراق ہے جب روح انسانی اپنے مرکز کی طرف لوٹنا چاہتی ہے اور وصال نہیں ہوتا تو آہ و فغاں کرتی ہے:

شاد باد اے عشق خود سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دولت نخوت و ناموسِ ما اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

(اے میرے اچھے جنون والے عشق، تو خوش رہ۔ اے میرے تمام بیماریوں کے علاج کرنے والے۔ اے میرے تکبر اور عزت طلبی کی دوا۔ اے وہ تو جو میرے لئے افلاطون اور جالینوس جیسا ہے۔)

مولانا روم نے معراج نبوی ﷺ کے واقعے کو بھی عشق کے تناظر میں پیش کیا ہے کہ عشق کی ہی بدولت جسم خاکی افلاک کی سیر کر لیتا ہے:

جسم خاک از عشق برافلاک شد کوہ در رقص آمد وچالاک شد
عشق بشگافد فلک دفلک راصد شگاف عشق لرزاند زمیں را از گزاف
با محمد بود عشق پاک جفت بہر عشق او را خدا لولاک گفت
وجود آدمی از عشق می رَسَد بہ کمال گر ایں کمال نہ داری کمال نقصان است

(مٹی سے بنے جسم نے عشق ہی کی بدولت آسمانوں کی سیر کر لی۔ پہاڑ جھوم اٹھا اور حرکت میں

آ گیا۔ عشق کی بدولت آسمانوں میں سیکڑوں شگاف ہو جاتے ہیں۔ عشق کی وجہ سے زمین لرز اٹھتی ہے۔ حضور ﷺ سے محبت ایک پاکیزہ محبت ہے۔ عشق ہی کے لئے اللہ نے لولاک کا نام دیا ہے۔ آدمی کے وجود کی عشق ہی کی وجہ سے کمال تک رسائی ہوتی ہے۔ اگر تیرے اندر یہ کمال نہیں ہے تو تو نقصان میں ہے۔)

مولانا تھانویؒ نے بھی اسی نوع کے عشق کی اپنی مثنوی میں حرف بہ حرف پیروی کی ہے۔ مثنوی زیر و بم کے کئی صفحات پر عشق کا یہی موضوع چھایا ہوا ہے۔ مولانا روم نے جہاں عشق کی بدولت افلاک پر پہنچنے کا ذکر کیا ہے وہیں مولانا تھانویؒ لامکاں اور عرش کا ذکر کرتے ہیں:

عشق آب است و تیمم غیر او — آب چوں آمدتیمم خواست زو

عشق مستغنی کند از دوجہاں — عشق عاشق را برد تا لامکاں

عشق عاشق را برد با لائے عرش — کم نماید از زمیں قالین و فرش

عشق طالب را کند باحق قریب — عاشقاں را می رساند تاحبیب

عشق چوں در قلب عاشق جا کند — ہر چہ جزیار است بیروں افگند

(عشق پانی ہے اور تیمم ماورا۔ پانی جب آ گیا تو تیمم رخصت ہوا۔ عشق دونوں جہاں سے عاشق کو مستغنی کر دیتا ہے۔ عشق ہی عاشق کو لامکاں تک لے جاتا ہے۔ عشق عاشق کو عرش پر لے جاتا ہے۔ زمیں سے قالین و فرش کم تر دکھتا ہے۔ عشق طلب رکھنے والوں کو خدا سے قریب کر دیتا ہے۔ اور عاشقوں کو محبوب تک پہنچا دیتا ہے۔ عشق جب عاشق کے دل میں جگہ بنالیتا ہے، اس وقت دوست کے علاوہ جو کچھ ہوتا ہے، اسے باہر کر دیتا ہے۔)

''ہائے وھو'' ایک کلمہ تاسف ہے جو اکثر یاس و محرومی کی کیفیت میں انسان کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔ اس لفظ کو مولانا روم نے جہاں استعمال کیا ہے وہیں مثنوی ''زیر و بم'' میں بھی اس کی پیروی ملتی ہے۔

**مولانا رومؒ:**

کایں فغان ایں سر ہمزاں است — ہا ئے و ہو روح از ہیہائے است

(بانسری کے دو منھ کو کچھ اس طرح تشبیہ دی ہے۔ کہ اس کا ایک منھ لب نے نواز کے منھ پر ہوتا ہے اور دوسرے منھ سے ہوا نکلتی ہے)

**مولانا تھانویؒ:**

ہائے وھو کرد از درد و الم می دریدے جیب و می گفتے زغم

(وہ درد والم سے ہائے وہو کر رہا تھا۔اپنی جیب کو پھاڑ رہا تھا اور غم کے ساتھ یہ کہہ رہا تھا۔)

عقیدۂ توحید کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے سر عبودیت کو خدائے واحد کے آگے نگوں کر دے۔ یہاں کسی غیر کی شرکت کا تصور ہی نہیں ہے۔اہل تصوف کے یہاں عشق مجازی و حقیقی کے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ عشق الٰہیہ کی تڑپ جب پیدا ہوتی ہے تو ماسوا اللہ کے ہر شے ہیچ نظر آتی ہے۔ایسے میں مثنوی کے اشعار سینوں میں عشق خداوندی کی آگ روشن کر دیتے ہیں۔ مولانا روم کہتے ہیں:

ہر کہ را جامہ ز عشقے چاک شد او از حرص و عیب کلی پاک شد

(جس شخص کا لباس عشق کی وجہ سے چاک ہو گیا۔وہ ہر طرح کے حرص و عیب سے پاک ہو گیا۔)

عشق حقیقی کا کمال ہے کہ جب وہ قلب میں جگہ بنالیتا ہے تو قلب کو خواہشات مادی سے یکسر خالی کر دیتا ہے اور قلب اللہ،اللہ کے ذکر سے گونج اٹھتا ہے۔اس موضوع کو مولانا تھانوی نے اس طرح واضح کیا ہے:

عشق چوں در قلب عاشق جا کند ہر چہ جزیار است بیروں افگند
قلب کس از عشق و حب خالی مباد آنکہ خالی ہست از وے نیست آباد

(جب عاشق کے دل میں عشق جگہ بنالیتا ہے،تو ایسی حالت میں دوست کے علاوہ ہر چیز کو باہر کر دیتا ہے۔ کسی کا دل عشق و محبت سے خالی نہ رہے۔ جس کسی کا دل عشق و محبت سے خالی ہوتا ہے،وہ کبھی آباد نہیں ہو سکتا۔)

مولانا تھانوی کے مرید خاص خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے اسی موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

اخذ و استفادے کی یہ چند مثالیں جو ''مثنوی معنوی''اور مثنوی ''زیر و بم'' کے چنندہ اشعار پر مشتمل ہیں ،کے پیش کرنے کا مقصد میدان تصوف کی دو برگزیدہ شخصیات کا تقابل ہر گز نہیں ہے،بلکہ اسے اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ جب عالم اسلام یورش فتنۂ تاتار سے بے حال ہو چکا تھا،اس وقت مثنوی کے اشعار بہت بڑا سہارا بن کر ابھرے تھے اور ایسے میں مثنوی کے تراجم اور شروحات سے پیدا نئے علم الکلام نے نہ صرف سنبھالا دیا بلکہ رومی نے اپنے بیکراں علم، عرفان ذات اور وجدانی بصیرت کا

استعمال کرکے اپنے دور میں پیدا، نت نئے مسائل اور ابھرتے فتنوں کے زہر کا تریاق بھی فراہم کیا۔ اسی طرح جب مولانا تھانوی نے بھی میدان عمل میں قدم رکھا تو دیکھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے جس پر آشوب دور کی آہٹ کو پہلے ہی محسوس کرلیا تھا وہ حقیقت بن کر سامنے کھڑا ہے۔ چودہویں صدی ہجری میں عالم اسلام مادیت اور حسیت کی زد میں تھا۔ یورپ سے درآمد نظریات اور سائنسی علوم مسلمان نوجوانوں کے قلوب کو زیروزبر کرکے شکوک وشبہات کے لئے راہ کھول رہے تھے۔ اس وقت مولانا تھانوی نے سیاست بے معاد کی فکر سے اپنے آپ کو علاحدہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پر زور دیا اور اپنی توجہ امت مسلمہ کی نسل نو کی کردار سازی کے لئے مرکوز کردی۔ عشق کے ولولے جو سرد پڑ چکے تھے، اب جاگ اٹھے۔ علامہ اقبال نے اپنی جاگتی آنکھوں سے ''میخانۂ رومی'' کے بام ودر کھلتے ہوئے دیکھے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> اقبال سے پہلے رومی کی نوعیت جزوی اور انفرادی تھی۔ یہ اقبال ہی تھے جن کے طفیل رومی کے افکار کی تشریح ہوئی جس سے وہ حیات اجتماعی اور ارتقائے انسانی کے ایک بڑے ترجمان اور محرم اسرار ثابت ہوئے[۷]۔

اقبال جب ''اسرار خودی'' کے منظر عام پر آنے کے بعد علمی حلقوں میں تنقید کی زد میں آگئے تھے، اس وقت چشم عالم نے دیکھا کہ ''کلید مثنوی'' اقبال کے لئے سب سے بڑا سہارا بنی اور ''عارف رومی'' کے اس ''مرید ہندی'' نے مولانا تھانوی کے ذریعے کھولے گئے ''میخانہ رومی'' میں پناہ لی۔ اقبال کا یہ اعتراف کسی سند سے کیا کم ہے: من در تفسیر مثنوی معنوی عقلاو انبالا رو مولانا اشرف علی تھانوی ہستیم[۸]۔ اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مولوی اشرف علی تھانوی سے پوچھئے وہ اس کی تفسیر کس طرح کرتے ہیں میں اس بارے میں انہی کا مقلد ہوں۔[۹]

---

[۷] مرزا اسلم، آئینہ خانہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۹، ص۷ (اس تبصرے کا اطلاق صرف اردو ادب پر ہوسکتا ہے: مدیر معارف)

[۸] فیضان اقبال شورش کاشمیری۔ نظریہ پاکستان ٹرسٹ، ۱۹۹۸، ص ۲۴۲

[۹] مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی محمد عبداللہ قریشی، آئینہ ادب، چوک مینار۔ انار کلی، لاہور ۲۰۱۱، ص ۲۲۱

# علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر سنیل کمار

گیسٹ فیکلٹی، دہلی یونیورسٹی

sk9971644727@gmail.com

برصغیر صدیوں سے رشیوں، صوفیوں وسنتوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں وقتاً فوقتاً صوفی سنت آتے رہیں ہیں اور اپنے خیالات سے لوگوں کو محبت کا درس دیتے رہے ہیں۔ چاہے وہ مہاتما بدھ ہوں یا مہاویر، کبیر، تلسی، میرا جی، بابا فرید یا پھر نظام الدین اولیا۔ ان سب نے محبت، امن و بھائی چارہ کی تعلیم دی۔ بیسویں صدی میں اقبال نے بھی ایک مفکر کی حیثیت سے جن تصورات کو پیش کیا ہے ان کا سر چشمہ ایک تصور ہے جسے اقبال نے ''خودی'' کا نام دیا ہے۔ اقبال کا یہ تصور ایک پورے نظام فکر کا جزو ہے۔ یہ پورا نظام فکر اس کی تشریح اور تفہیم کرتا ہے۔

حکما اور فلسفی ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور جو بعد میں آتے ہیں اپنے متقدمین کے فکر کی اصلاح کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ اس طرح سے ان کے اختلاف کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ اگرچہ فلسفیوں کا گروہ آج تک حقیقت کائنات کا صحیح تصور پیش کرنے سے قاصر رہا ہے تاہم جب سے اس گروہ نے حقیقت عالم پر غور کرنا شروع کیا ہے اس وقت سے لے کر اب تک ایک پر اسرار وجدان کی بنا پر اس بات کا پختہ یقین ان پر غالب رہا ہے کہ کائنات ایک ہے۔ اقبال بھی ایک فلسفی کی حیثیت سے وحدت کائنات کے قائل تھے۔ لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں ان کا تخیل بھی دوسرے شعرا کے مانند تھا۔

اقبال کی شاعری کے حوالے سے بات کریں تو ان کا شمار عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں جب بھی عظیم شعرا کا تذکرہ ہوتا ہے تو چار بڑے نام سامنے آتے ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ۔ اقبالؔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قانون داں اور سلجھے ہوئے سیاست داں بھی تھے۔ اقبال نے اردو اور فارسی دونوں میں معیاری شاعری کی وہ مثال قائم کی جس کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ اقبال کو بچپن میں اپنے استاد سید میر حسن کی صحبت میسر ہوئی جس کی وجہ سے انھیں بچپن سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

جہاں تک اقبال کی شاعری کی بات کریں تو ان کے ابتدائی دور کی شاعری وطنی شاعری پر مبنی ہے۔

اقبال کی اس دور کی شاعری میں وطنی تصور کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔اقبال نے اپنی شاعری کو حقائق کے رنگوں میں ڈھالا۔ وہ جس میدان میں بھی اترے خوبصورت تصویر بناتے گئے، وہ پھر چاہے وطن پرستی ہو یا قوم کی بیداری کا مسئلہ۔ انھوں نے ہر جگہ اپنی انوکھی چھاپ چھوڑی۔ اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور کی نظموں میں ان کی حب الوطنی اور وطن پرستی کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔اقبال کے پہلے شعری مجموعہ ''بانگ درا'' کا آغاز نظم ''ہمالہ'' سے ہوتا ہے۔ نظم ''ہمالہ'' ۱۹۰۵ء میں لکھی گئی تھی۔اس نظم کو وطنی شاعری میں اہم مقام حاصل ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

اقبال کی وطنی شاعری کا سلسلہ ہمالہ سے شروع ہوتا ہے اور بانگ درا کی کئی نظموں میں جاری رہتا ہے۔اس دور کی شاعری میں اقبال کی نظر ہندوستان کے ہر ذرہ کو آفتاب بنا کر دکھاتی ہے۔ یہاں کے کوہ، صحرا، ندیاں، چشمے، نظارے سب حب وطن میں جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ترانۂ ہندی میں وہ ہندوستان جنت نشان کو سارے جہاں سے اچھا قرار دیتے ہیں اور اس کی تہذیب و تمدن اور ان کے تسلسل و تنوع پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ وہ نانک اور چشتی کے وطن کو اپنا وطن بتاتے ہیں۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت لکھتے ہیں۔ خاک ہند کو اپنی امیدوں کا مرکز بناتے ہیں۔ رام، نانک اور رام تیرتھ کی عظمت کے ترانے گاتے ہیں۔ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور قومی اتحاد کے موضوع پر ''نیا شوالہ'' جیسی بے مثل نظم کہتے ہیں۔[1]

اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں جو چند متاثر کن اور حب الوطنی سے لبریز نظمیں لکھیں۔ان میں ''ہمالہ''، ''ترانہ ہندی''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اور ''نیا شوالہ'' قابل ذکر ہیں۔ نظم ''ہمالہ'' میں اقبال نے ہندوستان کی قدیم تہذیب، اس کے دلفریب مناظر اور اس کی عظمت رفتہ کا گن گایا ہے:

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے[2]

ان اشعار میں اقبال ہمالہ کی عظمت کو بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد اقبال اس کی سیاسی اہمیت کو بھی نظر

---

[1] گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳، ص: ۳۴۱-۳۴۲

[2] علامہ اقبال، کلیات اقبال، نظم ''ہمالہ''، علی گڑھ: علی گڑھ بک ڈپو، ۱۹۷۵، ص: ۲۹

انداز نہیں کرتے اور بڑے جوش و خروش سے کہتے ہیں:

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو دیوار ہندوستاں ہے تو[۳]

''ترانہ ہندی'' بھی اقبال کی وطن پرستانہ شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس نظم میں اقبال نے مادرِ وطن سے شدید محبت کا اظہار کیا ہے اور ہندوستان کی عظمت کو بیان کیا ہے۔ یہ ترانہ ہر ہندوستانی کے دل کے قریب ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا[۴]

اقبال نے اس نظم میں ہمالہ پربت کی عظمت کو بھی بیان کیا ہے:

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا[۵]

اس نظم میں اقبال نے مذہبی آہنگی اور قومی اتحاد پر بھی زور دیا ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا[۶]

قیام یورپ سے قبل اقبال نے اپنی نظموں میں غلامی سے چھٹکارا پانے اور اتحاد و اتفاق پر زور دیا۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی محبت کو ترجیح دی۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں ''نیا شوالہ'' اور ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اہم ہیں۔ نظم ''نیا شوالہ'' میں انھوں نے مندر و مسجد کی بنیادوں پر ایک نیا شوالہ بنا کر نقش دوئی کو مٹانے اور بچھڑوں کو ملانے پر زور دیا:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے[۷]

---

[۳] ماخذ سابق، ص: ۲۲

[۴] ماخذ سابق، نظم ''ترانہ ہندی''، ص: ۸۳

[۵] ماخذ سابق، ص: ۸۳

[۶] ماخذ سابق، ص: ۸۸

اس نظم میں اقبال نے قومی اتحاد کو اپنا محور بنایا ہے۔ وہ ہندوستانیوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آپسی نفرتیں ختم کرو اور وطن سے محبت کرو، چھوڑو ان دیر و حرم کے جھگڑوں کو:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں[۸]

ہندوستان کی رنگا رنگی میں وحدت کا تصور اور خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھنے کا تصور اردو شاعری میں نئی وسعتیں لے کر آیا تھا۔ لیکن قیام یورپ کے بعد اقبال کے وطنی نظریہ میں تبدیلی آئی اور انھوں نے اپنے وطنی کلام کو اپنی جاہلیت سے منسوب کیا۔ بہر حال اقبال کے یہاں وطن دوستی پر اور بھی نظمیں موجود ہیں جن میں نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اہمیت کی حامل ہے۔ ملاحظہ ہوں اس نظم کے چند اشعار:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے[۹]

اس نظم میں اقبال نے وطن کی عظمت اور وطن کی محبت کو بیان کیا ہے۔ ۱۹۰۵ کے بعد اقبال کے کلام میں جو تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ وطنی شاعری کی جگہ اقبال نے اپنی شاعری میں قومیت کو جگہ دی۔ اس دوران انھوں نے ہندوستانیوں کو غفلت کی نیند سے بیدار ہونے کا پیغام دیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> سفر یورپ کے بعد اقبال کی شاعری میں وطنی نقطۂ نظر سے ایک واضح موڑ پیدا ہوا۔ لیکن یہ حقیقت کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف نفرت کا جذبہ اقبال کی شاعری میں آخری وقت تک باقی رہا۔ سردار جعفری نے صحیح لکھا ہے کہ شروع بیسویں صدی میں ہندوستان کے بورژوا طبقے میں جو خود شناسی اور خود نگری پیدا ہو رہی تھی، اقبال کی شاعری میں وہ فلسفہ خودی کی شکل میں ڈھلنے لگی۔ یہ انتہائی مہلک ہتھیاروں سے مسلح سامراج

---

[۷] ماخذ سابق، ص:۸۸

[۸] ماخذ سابق ،ص:۸۸

[۹] علامہ اقبال، کلیات اقبال، نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، علی گڑھ: علی گڑھ بک ڈپو، ۱۹۷۵، ص:۸۷

کے مقابلے میں ایک محکوم قوم کی ابھرتی ہوئی تحریک آزادی کی داخلی اور جذباتی طور سے اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی کوشش ہے۔"[10]

اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں ہندو مسلم اتحاد اور وطن پر جو نظمیں لکھی تھی ان کی وجہ سے اقبال مسلمان اور ہندو دونوں میں کافی مقبول ہو گئے۔ اقبال کو ہندوستانیوں کی تنگ نظری اور تعصب سے بہت افسوس ہوتا تھا۔ چونکہ اقبال بہت ذہین اور دور اندیش انسان تھے اس لیے وہ ہندوستانیوں کو ان کی خامیوں سے آگاہ کرتے تھے اور انھیں محبت اور امن کا پیغام دیتے تھے۔ اگرچہ بعد میں ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی لیکن قیام یورپ سے قبل لکھی گئی نظمیں اس زمرے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''تصویر درد'' پیش ہے۔ اس نظم میں وہ ہندوستان کی قسمت پر ان الفاظ میں اظہار افسوس کرتے ہیں:

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

ایک اور شعر میں کہتے ہیں:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں[11]

نظم ''تصویر درد'' میں اقبال اپنے ہم وطنوں کو خبردار کرتے ہیں کہ وہ شاندار ماضی کی داستانوں میں نہ کھو جائیں بلکہ زمانۂ حال اور مستقبل کی پرواہ کریں۔ ان کے نزدیک ملک کے حالات صرف آنسو بہانے سے نہیں سدھریں گے بلکہ اس کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی:

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر　　زمیں پر تُو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں[12]

اس نظم میں اقبال نے وطن کی موجودہ صورت حال کی اندوہناک تصویر پیش کی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعے اہل وطن کو فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری سے دور رہنے کی تلقین کی اور قومی اتحاد اور باہمی محبت پر زور دیا:

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں　　یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

---

[10] گوپی چند نارنگ، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳، ص: ۳۸۰

[11] علامہ اقبال، کلیات اقبال، (نظم) تصویر درد، علی گڑھ: علی گڑھ بک ڈپو، ۱۹۷۵، ص: ۶۸

[12] ماخذ سابق، ص: ۷۱

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو[۱۳]

اقبال قومی یک جہتی کا مکمل شعور رکھتے تھے۔اس لیے انھوں نے قومی اتحاد پر زور دیا:

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا[۱۴]

یہ اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ اقبال کے یہاں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کا جذبہ بہت شدید تھا۔ وطن کی محبت اور وطن کے عظیم صوفی بزرگوں کے کارناموں کو انھوں نے بہترین انداز میں بیان کیا۔ اس کے علاوہ اقبال نے اپنی ایک غزل کے اشعار میں وطن کی یاد میں اپنا درد بیاں کیا ہے:

یوں تو اے بزم جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی[۱۵]

علامہ اقبال کے حب وطن کے شدید جذبے کو ''بچے کی دعا'' اور ''صدائے درد'' جیسی نظموں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نظم ''بچے کی دُعا'' میں وطن کے سجنے سنورنے اور اس میں پھول کی مانند زندگی بسر کرنے کی تمنا کی ہے:

ہو مرے دم سے یوں ہی مرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت[۱۶]

نظم ''صدائے درد'' میں علامہ اقبال وطن عزیز میں رونما ہونے والے مسلسل فرقہ وارانہ اختلافات پر بے چینی ظاہر کی ہے:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو میں ہاں ڈبو دے، اے محیط آب گنگا تو مجھے
سر زمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے[۱۷]

اقبال نے اپنے پہلے دور کی نظموں میں ایک عام ہندوستانی کی طرح اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا۔اس دوران انھوں نے وطن کے متعلق جو بھی نظمیں لکھی وہ ہندوستانیوں کے دلوں کو چھو گئیں۔ایسی ہی

---

[۱۳] ماخذ سابق: ص ۲۷

[۱۴] ماخذ سابق: ص ۲۷

[۱۵] ماخذ سابق، ص: ۱۳۸، ۱۳۹

[۱۶] ماخذ سابق، ''نظم بچے کی دعا''، ص: ۳۴

[۱۷] ماخذ سابق، نظم ''صدائے درد''، ص: ۴۲

ایک نظم ''پرندے کی فریاد'' ہے جس میں انھوں نے غلامی کے درد بھرے قصے کو بڑے دردانگیز لہجے میں بیان کیا ہے۔اس میں پرندے کو ہندوستانی قوم کے طور پر پیش کیا ہے۔جو پنجرے میں قید ہے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں اب وہ اپنے گھونسلے کی اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم شبنم کے آنسوؤں میں کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں[18]

اس نظم کا ایک بند جو سب سے جاندار ہے جہاں ایک پرندہ وطن کی جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا اور تڑپ کر کہتا ہے:

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دکھتے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے[19]

اس نظم میں اقبال نے ہندوستانیوں کی مظلومیت کو بیان کیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہندوستانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔اقبال کی پہلے دور کی نظموں میں وطنیت کا جلوہ نظر آتا ہے لیکن سفر یورپ کے بعد اقبال کے نظریے میں تبدیلی آئی اور انھوں نے اس دوران وطنیت سے ہٹ کر مسلم قوم کی زبوں حالی پر نظمیں لکھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے حالات سدھارنے کے لئے اپنی نظموں میں فلاح و بہبود اور اصلاحی روش کو اختیار کیا اور اپنے محدود وطنی نظریے کو لا محدود کیا۔

ان کا یہ ماننا تھا کہ ہر ملک میرا ملک ہے کیوں کہ ہر ملک کا مالک خدا ہے۔اپنے نظریے کی تبدیلی کی وجہ سے وہ یہ مان رہے تھے کہ آپسی جنگ وجدل کی ذمہ دار قوم پرستی ہے اور قوم پرستی کا محدود نظریہ ہی مختلف قوموں میں تصادم کو بڑھاتا ہے۔اس لیے قوم پرستی مستقبل کے لئے خطرہ ہے۔اس کے متعلق وہ کہتے ہیں:

---

[18] ماخذ سابق، نظم ''پرندے کی فریاد''، ص: ۳۷

[19] ماخذ سابق، ص: ۸۳

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے[۲۰]

۱۹۳۱ کے بعد اقبال کے نظریات میں پھر سے تبدیلی آئی اور اس دوران ان کے کلام میں پھر سے حب الوطنی کے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔ "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ میں شائع ہوا اس میں بھی حب الوطنی کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ "جاوید نامہ" دانتے کی "طربیہ خداوندی" کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ اس میں اقبال نے رشی وشوامتر کو بڑے احترام سے یاد کیا ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبال عظیم صوفی مولانا رومی کے ساتھ عرش کی سیر کرتے ہوئے جنت میں جاتے ہیں۔ وہاں ان کی ملاقات برہم رِشی وشوامتر سے ہوتی ہے۔ ہندو عقیدے کے مطابق رشی وشوامتر برہم رشی بننے سے پہلے راجا تھے۔ ایک دن رشی وششٹھ کے ساتھ ان کی بد کلامی ہوئی۔ رشی وششٹھ کی غیبی قوت کے آگے وشوامتر کی ایک نہ چلی۔ یہ دیکھ کر وشوامتر نے بھی غیبی طاقت حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ اور راج پاٹھ چھوڑ کر رشی بن گئے۔ اقبال ان ہی وشوامتر کو اپنا دوست بتاتے ہیں۔ جب اقبال اپنے دوست وشوامتر سے ملتے ہیں تو وہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ مشرق کے بیدار ہونے کا وقت آگیا ہے اور اب جلد ہی ایک نیا سورج طلوع ہونے والا ہے:
جسے اقبال نے اس طرح سے بیان کیا ہے۔:

گفت ہنگام طلوع خاور است — آفتاب تازہ اورا در براست
دستخیزی در کنارش دیدہ ام — لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام
عرشیاں را صبح عید آں ساعتی — چون شود بیدار چشم ملتی[۲۱]

(وشوامتر کہتے ہیں کہ یہ مشرق کے بیدار ہونے کا وقت ہے اور ایک نیا سورج اس کے پہلو میں ہے۔ میں نے اس کے آغوش میں ایک ہنگامہ اور اس کے کوہساروں میں لرزہ دیکھا ہے۔ آسمان والوں کے لئے وہ عید کا دن ہوگا جب ایک قوم خواب غفلت سے اپنی آنکھیں کھولے گی۔)

"جاوید نامہ" میں اقبال نے ہندوستان کی روح کا خوبصورت روپ بیان کیا ہے، لیکن غلامی پر آنسو بھی بہائے ہیں۔ اس نالہ و شیون میں علامہ اقبال کے قوت جگر کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

اپنے آخری دور میں اقبال کے نظریے میں جو تبدیلی آئی تھی اس تبدیلی سے اقبال نے ہندو مسلم اتحاد

---

[۲۰] علامہ اقبال، کلیات اقبال، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، نظم "وطنیت"، ۱۹۹۷، ص: ۱۲۰

[۲۱] جاوید اقبال (مرتب) جاوید نامہ، نظم "جہاں دوست"، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۳، ص: ۳۷

کے نعرے کو دوبارہ دہرایا اور پھر سے مسلمان قوم کے محدود تصور کے بجائے پورے ہندوستان کو اپنی فکر میں سمودیا جس کی تصدیق ان کے مجموعہ ''ضرب کلیم'' کی دو نظموں ''گلہ'' اور ''شعاع امید'' سے ہوتی ہے۔ ان نظموں میں بھی علامہ اقبال کا دل وطن کی محبت میں تڑپتا ہے۔ ملاحظہ ہوں نظم ''گلہ'' کے یہ اشعار:

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا ابلا ہوا مردہ بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے [۲۲]

اقبال اسی طرح نظم ''شعاع امید'' میں وطن کے متعلق اپنے تاثرات بیاں کرتے ہیں:

اک شوخ کرن شوخ مثال نگہ حور آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو جب تک نہ ہو مشرق کا ہر ایک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب [۲۳]

اقبال نے اپنے کلام میں وطن اور قوم کو ہی نہیں سمویا بلکہ انھوں نے وطن کی مقدس و برگزیدہ ہستیوں کو بھی بڑی عقیدت و محبت سے یاد کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں رام چندر جی کا خاکہ جس طرح سے کھینچا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کو رام چندر جی سے گہری عقیدت تھی۔ جس کی ایک مثال ان کی نظم ''رام'' ہے۔ اس نظم میں رام چندر جی کی سیرت کو جس چابکدستی سے پیش کیا ہے اسے ایک مصور کی کاریگری کہا جاسکتا ہے:

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا [۲۴]

اسی طرح گرونانک کو اقبال اپنی نظم ''نانک'' میں اپنی خراج عقیدت یوں پیش کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

---

[۲۲] علامہ اقبال، کلیات اقبال، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، نظم ''گلہ''، ۱۹۹۷، ص: ۱۲۷

[۲۳] ماخذ سابق، نظم ''شمع امید''، ص: ۹۰

[۲۴] ماخذ سابق، نظم ''رام''، ص، ۱۳۴

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے[۲۵]

ان کے علاوہ علامہ اقبال نے سوامی رام تیر تھ، شنکر آچاریہ، بھرتری ہری اور گوتم بدھ کا تذکرہ بھی بڑے احترام اور عقیدت سے کیا ہے جو علامہ اقبال کی وطن سے گہری محبت کی دلیل ہے۔ علی سردار جعفری علامہ اقبال کی حب الوطنی کے متعلق لکھتے ہیں:

> اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ خون بہار کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔[۲۶]

مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے کلام میں حب الوطنی کا جذبہ جس طرح پایا جاتا ہے اس معاملے میں ہندوستان کے بہت ہی کم شعرا ان کے مد مقابل نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کا کلام آج بھی ہمیں انسانیت اور حب الوطنی سے سرشار کرتا ہے اور ہمارے جذبۂ حب وطن کو پروان چڑھاتا ہے۔ اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری میں ہمیں ایک جوش کے ساتھ ماضی کو واپس لے آنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے، جس کی مثال نظم ''ہمالہ'' کے آخری مصرع ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' سے ملتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا طاقتور جذبہ یہ ہے کہ انسان زندہ کردار کی حیثیت سے تاریخ کے عمل میں حصہ لے۔ انھوں نے اپنی فکر میں اس جذبے کو ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے۔ آزادی کے متعلق بھی اقبال کا یہی نظریہ ہے۔ وہ انسان میں اختیار اور آزادی کی موجودگی کے قائل ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو جستجو، عزم، ہمت، حوصلہ، جدوجہد، بھائی چارہ اور عمل کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یورپ جانے کے بعد ان کے اس نظریے میں تبدیلی آئی۔ اس دوران ''وطن'' ان کے نزدیک ایک محدود ذہن کی علامت بن گیا۔ انھوں نے ایک ہی وطن کو اپنا معبود اور نصب العین قرار دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے بعد کے کلام میں وطن کو مختلف جگہ دیوتا اور خدا کے نام سے پکارا ہے۔ جیسے کہ ''ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے''۔ اقبال کا خیال یہ تھا کہ وطنیت کا یہ محدود سیاسی نظریہ انسانیت کا قاتل ہے کیونکہ اس کے باعث انسان انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

---

[۲۵] ماخذ سابق، نظم ''نانک''، ص: ۱۸۳

[۲۶] علی سردار جعفری، ''اقبال شناسی''، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۸ء، ص: ۱۱

# اخبار علمیہ

## پس دیوار دیکھنے کی تکنیک کی ایجاد

سائنس دانوں کے ایک گروپ نے ایک ایسی تکنیک کو ترقی دی ہے جو مصنوعی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے وائرلیس سگنلز کا تجزیہ کرکے دیواروں اور دروازوں کے پیچھے موجود چیزوں کو پہچاننے کے قابل بنا سکتی ہے۔ برطانوی اخبار انڈپنڈنٹ کے مطابق یہ تکنیک امریکی کارنیگی میلن یونیورسٹی میں کام کرنے والی ٹیم نے تیار کی ہے۔ یہ انتہائی نازک اور حساس نٹ ورک ہے جو (جس کی شعاعیں) دیواروں میں داخل ہو کر انسانی جسموں کا ڈیجیٹل نقشہ کھینچ سکتا ہے۔ سائنس دانوں نے لکھا ہے کہ دیوار کے پیچھے وائرلیس سگنلز (اشارے) موصول ہونے کے بعد ''ڈینس پوز'' نامی مصنوعی ذہانت کا نظام جو اصل میں مصنوعی ذہانت کے محققین نے ''میٹا'' نامی کمپنی میں تیار کیا ہے، پس دیوار موجود شخص کے جسم کی تفصیل اور اس کے طول و عرض کا تجزیہ کرتا ہے۔ اسکالرز نے کہا کہ انہوں نے اس ٹکنالوجی کو ترقی اس مقصد سے دی ہے تاکہ موجودہ دو اور تین جہتی کمپیوٹر ویژن ٹولز جیسے کیمرے، ایل ای ڈی اور راڈار اب اس لائق ہوں کہ یہ بھی بتا سکیں کہ دیواروں کے پیچھے کیا ہے؟ یعنی ان کی محدودیت اور قید بندی کو ختم کیا جا سکے۔ (اخبار الوطن، بحرین ۲۷ جنوری ۲۰۲۳ء ص ۲۰)

## خطرے سے دوچار دو عرب مقامات عالمی ثقافتی ورثہ کی فہرست میں شامل

ایک قدیم یمنی سلطنت کے آثار اور جدید لبنانی کنکریٹ والی نمائشی عمارتوں کے علاقہ کو جن کا وجود خطرہ میں ہے یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثہ کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ یونیسکو نے اپنی ویب سائٹ پر کہا ہے کہ اس کی عالمی ثقافتی ورثہ کمیٹی نے ایک خصوصی اجلاس کے دوران سات آثار قدیمہ کے مقامات کو عالمی ثقافتی ورثہ میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو پہلی صدی قبل مسیح سے ۶۳۰ عیسوی کے قریب ظہور اسلام تک سبا کی تعمیراتی، جمالیاتی اور تکنیکی کامیابیوں اور خوبیوں سے بھرپور سلطنت کا گواہ رہے ہیں۔ قدیم یمنی سلطنت کی سات اہم یادگاروں اور طرابلس میں رشید کرامی عالمی گیلری جہاں فلم سازی اور موسیقی وغیرہ کے عالمی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں کو اقوام متحدہ کی فہرست میں ''فوری اقدام'' کے تحت شامل کیا گیا ہے تاکہ نظر انداز کیے گئے مقامات کو بہتر طریقے سے محفوظ کیا جا سکے۔ یونیسکو کے مطابق دونوں مقامات اب بہتر تکنیکی اور مالی امداد کے مستحق ہوں گے۔ یونیسکو نے

مزید بتایا کہ قدیم مآرب میں آب پاشی اور زرعی نظام میں ایسی منفرد انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کی جھلک نظر آتی ہے جس کی دوسری نظیر قدیم جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں کہیں اور موجود نہیں ہے۔ مملکت سبا، موجودہ یمن کی تہذیب ان نمایاں تہذیبوں میں سے ایک ہے جو جزیرۂ عرب کے علاقہ میں پیدا ہوئی اور اس کو ملکہ سبا کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اسی طرح رشید کرامی عالمی گیلری لبنان کے ان جدید معالم میں سے ایک ہے جس کی بنیاد ۶۰ کی دہائیوں میں رکھی گئی لیکن قبل اس کے کہ اس پر مستقل کام ہوتا اور وہ مکمل ہوتا مالی وسائل کی کمی اور اس خطہ میں پے در پے خانہ جنگی کے حالات کے سبب اس کی تعمیر موقوف ہوگئی ہے۔ (اخبار الوطن، بحرین ۲۷ جنوری ۲۰۲۳ء ص ۲۰)

## تعلیم کے میدان میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی پر زور

جی ۲۰ ایجوکیشن ورکنگ گروپ (GEdWG) کی پہلی میٹنگ ۳۱ جنوری کو IIT مدراس میں شروع ہو رہی ہے۔ ہندوستان، تعلیمی میدان میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی کے استعمال میں اپنے اختراعات اور بہترین تجربات کو نمایاں کرنے کے لیے گروپ کے تمام اراکین کو ایک منفرد پلیٹ فارم فراہم کرنے کے لیے تیار ہے۔ جی ۲۰ ممبران، مہمان ممالک، او ای سی ڈی، یونیسکو اور یونیسیف جیسی مدعو تنظیموں کے ۷۵ سے زائد مندوبین، اکیڈمک ماہرین اور طلبہ اس اجلاس میں شرکت کریں گے۔ یہ سیمینار تعلیم میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی کے کردار کے موضوع پر ہوگا۔ دیگر تین میٹنگیں بھونیشور، پونے اور امرتسر میں ہوں گی۔ وزارت تعلیم کے ایک سینئر افسر نے اور باتوں کے ساتھ آئی آئی ٹی اور یونیورسٹیوں میں سیمیناروں اور میٹنگوں کے انعقاد کی وجہ بھی بتائی۔ ورکنگ گروپ کے اجلاسوں میں چار موضوعات تعلیم میں ڈیجیٹل ٹکنالوجی، بنیادی خواندگی، عددی مہارت اور تحقیق پر مبنی سیمینار اور نمائشیں ہوں گی۔ توقع ہے کہ رکن ممالک کی جانب سے تعلیم سے متعلق ایک محضر پر دستخط کیے جائیں گے۔ پہلے سیمینار میں تعلیم کے میدان میں ہندوستان کی کامیابیوں اور NEP 2020 کے ارکان بشمول SWAYAM,DIKSHA اور NIPU BHARAT کی تحقیق واختراع کے ساتھ ساتھ ہندوستانی نظام تعلیم کی نمائش ہوگی۔ سیمینار میں جی ۲۰ ممالک فرانس، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب اور ہالینڈ سمیت تمام اراکین کے مندوبین شرکت اور تعلیم کے شعبہ میں اپنی بہترین کارکردگی کی نمائش کریں گے۔ اجلاس اور سیمینار سے پہلے یہ پہلا موقع ہے جب ان ممالک سے معلومات طلب کی گئی ہیں۔ (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی، ۲۸ جنوری ۲۳ء ص ۱۸)

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

# محمد رسول اللہ، رحمت للعالمین
# از مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی

## محمد عمیر الصدیق ندوی

علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ کی تالیف کی ابتدا قریب ایک صدی پہلے ہوئی اور اسی سے اردو زبان میں سیرت نگاری کے منہجوں اور اسلوبوں کی ایک ایسی روایت کا بھی آغاز ہوا جس کو اہل تحقیق و نظر نے محدثانہ، مؤرخانہ، فقیہانہ، متکلمانہ، مناظرانہ وغیرہ خانوں میں تقسیم کرکے سیرت طیبہ پر مشتمل پورے ذخیرہ و سرمایہ کا جائزہ لیا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں سیرت کی جن کتابوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی، ان میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی، مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمت للعالمین اور مولانا حکیم ابوالبرکات داناپوری کی اصح السیر کا تذکرہ خاص طور سے کیا جاتا ہے۔ مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والے ایڈیشن میں رحمت للعالمین کے ناشر نے لکھا کہ قاضی صاحب نے سیرت کی ترتیب میں بہت احتیاط سے کام لیا اور صرف ان ہی روایات کو سامنے رکھا ہے جو معیار تحقیق پر پوری اتر چکی ہیں۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں انہوں نے صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے بلکہ انجیل، توریت و زبور اور کہیں کہیں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے بھی استفادہ کیا اور بہت کامیابی سے آنحضرتؐ کی رسالت اور ختم نبوت پر استشہاد کیا۔ ان ناشر کا نام موجود نہیں ہے تاہم آگے خود قاضی منصور پوری مرحوم کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں کہ انہوں نے صحیح روایات کے اندراج میں پوری کوشش وسعی کی ہے۔ اس کتاب کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح مولانا ابوالبرکات داناپوری کی کتاب اصح السیر ہے، جس کے مقدمہ میں مولانا داناپوری نے لکھا کہ اردو میں سیرت پر بہتر کتاب صرف ایک ہی اب تک لکھی گئی ہے اور وہ ہے مولانا شبلی کی سیرت نبوی، لیکن ان کی نظر میں علامہ شبلی نے مغازی پر جو کچھ لکھا وہ بادل ناخواستہ ہے خصوصاً غزوۂ بدر کے واقعات میں۔ مولانا داناپوری کا خیال تھا کہ واقعات کو الٹ پلٹ دیا گیا ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ کثرت تصنیف ہی کثرت اختلاف کا باعث ہے۔ یہ دعویٰ کیا کہ جو ترتیب انہوں نے مغازی کی رکھی

ہے غالباً وہ اصح ترین ہے۔انھوں نے توقع ظاہر کی کہ اہل علم ان کی کتاب میں کتاب المغازی کو جامع، مکمل اور بہترین ترتیب پر پائیں گے۔اصح السیر اس طرح دو حصوں میں منقسم ہو گئی، ایک تو آنحضورؐ کی مجاہدانہ زندگی اور دوسرے آپ کی پیغمبرانہ زندگی لیکن دوسرا حصہ تشنۂ اشاعت ہی رہا۔تاہم محققین کے نزدیک اصح السیر بہرحال مستند قرار پائی ۔ یہ بھی خیال سامنے آیا کہ مستشرقین کے اعتراضات اور الزامات کا جواب قرآن پاک اور حدیث صحیح کی روشنی میں دیا جائے۔اس پر ایک فاضل نے لکھا کہ شاید ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ مستشرقین کا کام محض اعتراض کرنا ہے۔اعتراض کے جواب سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔

ان دو اہم کتب سیرت کے ذکر کے ساتھ جب سیرۃ النبیؐ کی بات آئی تو اس قسم کے جملے اہم محققین کے قلم سے نکلے کہ یہ کتاب بیسویں صدی کیا معنی، گذشتہ کئی صدیوں کی ادبیات سیرت کی ممتاز ترین کتابوں میں ہے۔وجہ روح اور جذبہ کے ساتھ اس کا ادیبانہ شکوہ اور زور بیان میں اور بیانیہ جمال میں، دلیل کی قوت، تحریر و تجزیہ کی بلندی روایات کا محدثانہ، مورخانہ اور متکلمانہ جائزہ، ان سب نے سیرت النبی کو عالمی ذخیرہ سیرت میں ممتاز ترین مقام عطا کر دیا۔

ان تینوں مذکورہ کتابوں کے بعد سیرت نگاری میں مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری جیسے ناموں کے ساتھ اور بھی بے شمار نام سامنے آئے اور ایک احساس بھی یہ پیدا ہوا کہ ایسے قیمتی ذخیرے میں اب اضافے کی شاید گنجائش نہیں۔

مگر سیرت النبیؐ کے سو سال بعد جب مولانا تقی الدین ندوی کی کتاب محمد رسول اللہؐ: رحمت للعالمین تین جلدوں میں آئی تو یہ احساس قوی تر ہو گیا کہ سیرت کی ہر کتاب اپنے آہنگ، اسلوب، مغز و مواد اور فکر و نظر کی وجہ سے گواہی اس بات کی دیتی ہے کہ وان لک لاجرا غیر ممنون۔

مولانا تقی الدین ندوی کی اردو سیرت تین جلدوں میں ہے۔پہلی جلد سات سو دس، دوسری جلد چھ سو اسی اور تیسری جلد پانسو اڑسٹھ صفحات یعنی قریب دو ہزار صفحات پر تینوں جلدیں مشتمل ہیں۔

اصلاً یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔یہ اردو ترجمہ اصل عربی کتاب کا ہے۔اس کا انگریزی ترجمہ بھی زیر طباعت ہے۔

سیرت النبی، رحمت للعالمین اور اصح السیر اور دیگر کتب سیرت کی موجودگی میں اس قدر ضخیم اور مبسوط کتاب سیرت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ذہن میں اس سوال کا آنا تعجب کی بات نہیں، خود یہ

سوال مصنف کے ذہن میں آیا۔اسی لیے مقدمہ میں سبب تالیف بتاتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ :

سیرت کے موضوع پر عربی زبان میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں جن کی تدوین میں حالات وواقعات کی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے۔اس انداز کی اگر کوئی کتاب لکھنا چاہتا تو یہ کام قدرے آسان تھا لیکن میں نے ایسی کتاب لکھنا چاہی جس میں صحیح اور حسن روایتوں کو جمع کرنے کے ساتھ حالات وواقعات کا تجزیہ اور ان میں موجود اسرار و حکم کی نقاب کشائی اور دشمنانِ اسلام کا رد بھی ہو۔تالیف کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ میں نے محسوس کیا کہ مستشرقین عربی زبان کے رموز سے ناآشنا ہیں اور جو اس فن میں مہارت رکھتے ہیں وہ بھی اسلام دشمنی کی وجہ سے حق کا برملا اظہار نہیں کرتے ہیں۔بلکہ سیرت کے اہم نکات اور واقعات کو غلط معنی پہنا دیتے ہیں۔

ایک بات اور بھی کہی کہ ضرورت بہر حال باقی تھی کہ صحت کے التزام کے ساتھ روایات کی تحقیق کا بھی اہتمام ہو۔عام طور پر سیرت کی کتابوں میں ہر طرح کی روایت داخل کر دی جاتی ہیں۔ صحیح، حسن، ضعیف حتی کہ موضوع حدیثوں سے بھی سیرت کی کتابیں خالی نہیں ہیں۔

مولانا ندوی نے اس ضرورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کمال امانت داری سے اعتراف کیا کہ یقیناً علمائے متأخرین نے سیرت پر ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں فن اسماء الرجال اور اصول جرح وتعدیل سے کام لیتے ہوئے حدیثوں پر کلام کیا گیا اور ان کا درجہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود مولانا نے اپنی کتاب کیوں مرتب کی؟ اس کا جواب بھی ہے کہ سیرت النبیؐ کے مقدمہ میں علامہ شبلی کی تحریر، اس کے تکملہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریر، مولانا سلیمان منصور پوری اور مولانا علی میاں ندوی کی السیرۃ النبویہ کی تحریریں جب ان کی نظر سے گزریں، اس وقت سے ذہن ودماغ پر یہ خیال پوری طاقت سے چھا گیا کہ ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے موجودہ زمانہ کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سب کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔نبی پاکؐ کی زندگی سراپا رحمت وبرکت ہے، دنیا کو اپنے اخلاق ومعاملات میں اسی رحمت اور اعتدال وتوازن کو اپنانے کی ضرورت ہے۔جن سیرت نگاروں نے اس پہلو کی طرف خاص توجہ دی ہے ان سے حتی الامکان استفادہ کی کوشش کی ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ مولانا ندوی کے سامنے کسی تحقیق جدید سے زیادہ اردو کے سیرت نگاروں خصوصاً علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے وہ مباحث پیش نظر تھے جن سے عالم عرب کو عربی اور پھر یورپ کو انگریزی زبان کے ذریعہ متعارف کرنے میں زیادہ نفع اور فائدہ کی امید تھی۔

فاضل سیرت نگار کی پوری زندگی ہی ذکر و حدیث رسولؐ میں گزری ہے۔ ہندوستان میں وہ اس وقت حدیث کے علم و تحقیق اور بعض نہایت اہم احادیث کے مجموعوں کی ترتیب و تدوین و تعلیق کی وجہ سے ائمہ محدثین کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کتابِ سیرت کی اس خوبی کا اظہار جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے استاذ حدیث شیخ موفق بن عبداللہ نے یہ کہہ کر کیا کہ اس کتاب میں محدثین کے منہج کی پیروی ہے۔ تونس کے شیخ ابولبابہ نے اس خوبی کا اظہار کیا کہ مولانا ندوی نے ضعیف اور اسرائیلی روایات سے مکمل گریز کیا ہے بلکہ ایسی روایات کا ذکر کر کے ان پر سخت نقد و جرح کی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی نے ایک اور خصوصیت کی جانب اشارہ کیا کہ آنحضورؐ کی ذات و سیرت پر لکھنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ حرمین شریفین پر بھی گفتگو کی جائے۔ اسلام میں مکہ و مدینہ کے جو مخصوص احکام ہیں اور جو کتاب اللہ اور نبی کریمؐ کی سنت و سیرت سے ثابت ہیں ان پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے مولانا ندوی نے اپنی کتاب میں محفوظ رکھا ہے۔

مولانا نے حرمین شریفین کے متعلق قدیم ترین کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ امام مالک کے شاگرد محمد بن حسن زبالہ مخزومی متوفی ۲ھ کی ایک کتاب جس کو حاجی خلیفہ نے اخبار المدینہ کا نام دیا اور یہ ۲۰۰۳ء میں مدینہ منورہ کے مرکز البحوث والدراسات سے شائع ہوئی، اس سے استفادہ کیا گیا۔ اسی طرح عمر بن شبہ کی کتاب اخبار المدینۃ، تقی الدین الفاسی کی العقد الثمین فی اخبار البلاد الامین اور محمد بن اسحاق الفاکہی کی تاریخ مکہ کا اپنے ماخذ میں ذکر کیا ہے۔

حدیث شریف کے بیان میں جو احتیاط اور واقعات و حالات کی جو مرجعیت ہے اس سے سیرت ایسی معتبر اور واقعیت کی حامل بنتی ہے، جو تاریخی انداز بیان میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مولانا سید محمد رابع ندوی نے بتایا کہ کتاب میں اسی انداز بیان کو اختیار کیا گیا ہے۔

مولانا ندوی نے گرچہ علامہ شبلی اور ان کی سیرت النبیؐ کے اثرات کا بار بار ذکر کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت نبویؐ کے اولین مصادر کی انہوں نے جس طرح درجہ بندی کی ہے وہ سیرت کے ہر طالب علم کے لیے نہایت نفع بخش ہے۔ ماخذ میں انہوں نے بالترتیب قرآن کریم، حدیث و سنت کی کتب، معجزات نبوی کی کتب، شمائل نبوی اور مغازی و سیرت کی کتابوں پر جامع معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ایک باب علم و تاریخ کی عدالت میں تصانیف سیرت کا بھی قائم کیا۔ تصانیف سیرت کی عدالت میں واقدی ہمیشہ حاضر نظر آتے ہیں۔ مولانا نے واقدی پر محدثین کی زبردست تنقید کا ذکر کیا، امام نسائی اور ابن ماجہ کی رائیں نقل کی ہیں لیکن اس کے بعد لکھتے ہیں:

بندۂ ناچیز کہتا ہے: واقدی نے اپنی کتاب میں ہر طرح کے رطب ویابس کو جمع ضرور کر دیا ہے لیکن ان کی کتاب کی تلخیص حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے ماہر جرح وتعدیل نے کی ہے۔ ابراہیم حربی اور ابن سعد نے جس طرح واقدی پر اعتماد کیا ہے اس لحاظ سے واقدی کی روایات کو یکسر مسترد نہیں کر سکتے بلکہ محدثین کے قواعد کی روشنی میں ان روایتوں پر بھی صحت وضعف کا حکم لگا کر صحیح اور ضعیف ولغو روایتوں کو الگ کر سکتے ہیں۔ طبری اور ابن سعد محدثین کے نزدیک بالاتفاق ثقہ اور مستند ہیں، پھر بھی ان کے ہاں ضعیف بلکہ موضوع روایتیں مل جاتی ہیں۔

اس طرح مولانا کی اس کتاب سیرت کی ضرورت اور اس کی افادیت سامنے آتی ہے۔ رحمت للعالمین کی خصوصیت کو کتاب کے نام میں شامل کرنا خود مصنف کی نیت اور ان کی غرض وغایت کی غماز ہے۔ موجودہ دور میں جس طرح اسلام اور مسلمانوں کو تشدد اور دہشت گردی اور غیر انسانی قوانین کے الزاموں سے ہدف تنقید بنایا جارہا ہے اور خود پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ کو نہایت شیطانی مکر وفریب سے ایک بالکل متضاد صورت میں پیش کرنے کی سازشوں کو متحدہ عالمی کفریہ تشہیر کا حصہ بنایا جارہا ہے اس میں قرآنی حقیقت وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کی حقیقت کشائی پہلے سے کہیں زیادہ ضروری اور مطلوب ہے۔ اصلاً یہی جذبہ اس پوری کتاب سیرت میں جاری وساری ہے۔

ایک جگہ مولانا ندوی نے امام احمد کا یہ مشہور قول نقل کیا کہ ”تین علوم کی کوئی بنیاد نہیں ہے: تفسیر، ملاحم اور مغازی اور پھر اس قول پر یوں کلام کیا کہ:

سب سے پہلے خود اس قول کی صحت ہی میں شبہ ہے، کیوں کہ امام احمد نے اپنی مسند میں تفسیر، مغازی اور ملاحم کی حدیثیں کثرت سے بیان کی ہیں۔ اس سے ان کے مذکورہ قول کی خود ہی تردید ہو جاتی ہے۔ دوسرے صحت کی نفی سے حدیث کا موضوع یا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ملا علی قاری کا قول ہے کہ عدم ثبوت سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ حافظ ابن حجر نے تخریج الاذکار میں بیان کیا ہے کہ امام احمد سے ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا: وضو کے اندر تسمیہ کے تعلق سے مجھے کوئی حدیث نہیں معلوم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نہ جاننے سے نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر مان بھی لیا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ثبوت کی نفی سے ضعف ثابت نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ثبوت سے مراد صحیح حدیث کا ثبوت بھی ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے حسن کی گنجائش بہر حال باقی رہتی ہے۔ یہ پوری بحث صاف ظاہر کرتی ہے کہ مولانا ندوی کا علم حدیث میں تبحر اس کتاب کی تالیف کا سب سے اہم عنصر ہے۔ کتاب کے مآخذ میں قریب اسی فیصد حوالے کتب احادیث کے ہیں اور یہیں سے مولانا کی کتاب سیرت کی وہ امتیازی

حیثیت نمایاں ہوتی ہے جس کو مصنف علام نے ازراہ انکسار دوسری کتب سیرت کے مطالعات کا نتیجہ بتایا ہے۔جواد علی کی المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام کے حوالے سے یہ بات کم ہی جگہ ملے گی کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مکہ بعثت نبوی کے وقت ایک چھوٹا سا گاؤں تھا،وہ عربوں کی تاریخ اور ان کے حالات سے محض بے خبر ہیں۔مکہ چھٹی صدی عیسوی ہی میں ابتدائی بدویانہ عہد سے نکل کر تمدنی و شہری نظام میں داخل ہو چکا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ام القریٰ کہا ہے۔مکہ کا نظام رضاکارانہ اتحاد کی بنیاد پر قائم تھا۔

سیرت نگاری میں محدثانہ طرز بیان کا گویا التزام ہے جو غیر شعوری ہو سکتا ہے لیکن مصنف کی حدیثی فکر اور اہتمام کا فطری اظہار بھی کہا جا سکتا ہے، جیسے رسول اللہ کی کنیت کی بحث میں ابوالمومنین کا ذکر کر کے اور شامی کا یہ قول نقل کیا کہ قرآن مجید میں النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم وازواجہ امہاتہم ہے، یہاں حضرت ابی بن کعب وھواب لہم بھی پڑھتے تھے۔مولانا نے یہ قول نقل کیا لیکن بغیر کسی تبصرہ کے واللہ تعالیٰ اعلم کہہ کر خاموش ہو گئے۔البتہ حاشیہ میں امام نووی،امام بغوی اور سنن ابی داؤد کے کئی اقوال نقل کر دیے۔اسی طرح شق صدر کی بحث میں وہ بڑے اعتماد سے لکھتے ہیں کہ شق صدر کے اوقات کی تعیین صرف مختلف روایتوں کو پیش کرنے سے نہیں ہو سکتی،جیسا کہ ابن حجر،قسطلانی اور زرقانی نے کیا ہے بلکہ ان روایات کے سلسلہ سند اور راویوں کے ضعف و قوت پر نقد کر کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔اس پوری بحث کے آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی کے مفصل کلام کے مطالعہ کی جانب توجہ دلاتے ہیں یعنی صاف ظاہر ہے کہ وہ سیرت النبی کی بحث کو راجح قرار دیتے ہیں۔پہلی جلد غزوہ احد پر ختم ہوتی ہے۔دوسری جلد آپؐ کی وفات اور پھر ترکہ و آثار مبارکہ،آپؐ کی ازواج مطہرات کے مکانات اور آپؐ کی دایہ کے بیان پر پوری ہوتی ہے۔اس میں آپؐ کے زمانہ علالت کے چند نہایت اہم اور موضوع بحث بننے والے واقعات میں بھی مولانا کی محدثانہ نظر نے معاملات کو بڑی آسانی سے قابل فہم بنا دیا۔ غدیر خم سے سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات تک مولانا ندوی کے انداز و اسلوب نے بتایا کہ وہ کس شان سے مشکل مراحل سے گزر گئے ہیں۔تیسری اور آخری جلد کے موضوعات میں رسول اکرمؐ کے شمائل و فضائل،اخلاق و عادات،معجزات و مبشرات کے ساتھ خصوصیات محمدیہ،خصائص ذاتیہ و نبویہ پر سیر حاصل بحث آ گئی ہے۔کتاب کے نام میں ادائے فریضۂ رسالت اور معلوم جہانوں کے لیے سرمایہ رحمت کی جانب اشارہ ہے۔تیسری جلد میں کائنات کے لیے باعث رحمت پر گفتگو خود باران رحمت میں بدل جاتی ہے۔رحمت،اخلاق حسنہ،اعتدال و وسطیت،انسان کے مقام بلند سے آشنائی،اخوت اسلامی

کا حق، دین مساوات، علم نافع اور عمل صالح، نرمی اور ملائمت کے داعی جیسے مضامین نے واضح کر دیا کہ محض بائبل کی روایتوں اور دوسری قوموں کے اعتراضات کا رد یا محض مغازی کے بیان میں سیرت کے سمندر کو محدود کرنا ہی مقصود نہیں بلکہ شبلی و سلیمان کے اس منہج کی ترجمانی ملحوظ ہے جو اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر معاصر اسلوب کی خوبصورتی کو بھی پیش نظر رکھے۔ مصادر و حوالہ جات کی وضاحت بھی اسی اسلوب کا ایک حصہ ہے۔ مولانا ندوی نے اپنی اس کتاب کی تیاری میں عربی اور اردو کی قریب ساڑھے تین سو کتابوں کو اپنا ماخذ و مصدر بنایا ہے۔ کتاب کی تحقیقی اہمیت کے لیے یہی کافی ہے۔ ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے کہ نبی اکرمؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقام و مرتبہ، ان کے درمیان فرق مراتب اور ان کے فضائل پر گفتگو کو بجا طور پر سیرت پاک کا جزو بنایا گیا اور خلفائے راشدین کا جدا ذکر بھی اس شان سے ہے کہ ان کے درمیان ترتیب کو ترتیب ربانی کا عنوان دیا گیا۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بعض ضروری مقامات پر عمدہ نقشے بھی دیے گئے ہیں۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے یہ رواں بھی ہے اور سلیس بھی۔ تاہم یہ اور بھی شگفتہ ہو سکتا تھا۔ بعض جگہوں پر عربی الفاظ کی جگہ اردو کے آسان الفاظ زیادہ مناسب ہوتے۔ بعض مباحث جیسے حضرت عائشہؓ کی شادی کے وقت ان کی عمر کے بیان میں بعض سوالات کے جواب مل جاتے تو ایک طبقہ کی تشویش دور ہو جاتی۔

کتاب جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ کے مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی سے شائع ہوئی۔ سرورق کی دیدہ زیبی اور حسن سلیقہ سطر سطر سے نمایاں ہے۔ قیمت درج نہیں ہے، مجلد ہونے کے ساتھ اس کی تقطیع بھی عام کتابوں سے قدرے بڑی ہے۔ اعظم گڑھ، دیوبند اور لکھنؤ کے مشہور مکتبوں کے نام، ملنے کے پتے میں شامل ہیں۔ سن اشاعت ۲۰۲۲ء ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ ترکی، پروفیسر سعود بن ابراہیم امام حرم مکی، ڈاکٹر ابولبابہ طاہر صالح حسین رئیس جامعہ زیتونہ، ڈاکٹر موفق بن عبداللہ، مولانا محمد تقی عثمانی کے مقدموں اور مولانا سید محمد رابع حسنی کی تقریظ نے کتاب کی قدر و قیمت کا گویا اعلان کر دیا۔ علامہ شبلی کی سیرت کے سو سال بعد، مولانا ندوی کی یہ کتاب سیرت کے لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہے۔

# تبصرۂ کتب

**شیر شاہ سوری: عہد حکومت اور معنویت :** ترتیب و تزئین، ظفر عبد الرؤف رحمانی، مدیر، صفدر امام قادری، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۴۱۶۔ ملنے کا پتہ: فروغ ادب، رحمانی فاؤنڈیشن، بیلن بازار، مونگیر، بہار۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔ سن طباعت ۲۰۱۹ء۔ موبائل و ای میل: درج نہیں۔

شیر شاہ سوری اور اس کے کارناموں پر انگریزی اور اردو میں کئی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں پرفیسر کالکا رنجن قانون گو کی مشہور انگریزی کتاب شیر شاہ اینڈ ہز ٹائم ۱۹۲۱ میں منظر عام پر آئی۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۹۸۱ میں رام آشرے شرما نے شیر شاہ اور اس کا عہد کے نام سے کیا۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مسلم حکم راں نے اپنے عہد میں ایک سیکولر حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس میں ہر طبقہ کو ہر طرح کی آزادی و مساوات اور رعایا کے حقوق کو پوری پاسداری حاصل تھی۔ اس کی ساحرانہ شخصیت کا یہی پہلو عام ہندوستانیوں کے لیے سب سے زیادہ پر کشش ہے۔ گو اس کو حکومت کا زیادہ موقع نہیں ملا تاہم مختصر مدت میں اس عظیم الشان شہنشاہ کے عہد میں ملک نے تعمیری، رفاہی، تمدنی، ثقافتی، انتظامی، فوجی، زرعی ترقی کی اعلیٰ مثال پیش کی۔ اس کے علاوہ عوام کو خوش حال و فارغ البال اور پر امن رکھنے اور ہندوستان کو مضبوط و مستحکم ملک بنانے کے سلسلہ میں جس حیرت انگیز صلاحیت کا مظاہرہ کیا اس کی نظیر بھی مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ اس کے ترقیاتی کاموں کے نقوش آج بھی اطراف ملک میں موجود اور اس کے پر وقار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ موجودہ ہندوستانی فکر و نظر میں اس شخصیت کو جو التفات و استحقاق ملنا چاہیے اب تک نہیں ملا۔ ضرورت ہے کہ اس عظیم الشان شہنشاہ کے کارناموں کو ملک کی موجودہ نسل کے سامنے لایا جائے جو اپنے اسلاف کے کارناموں سے بے خبر ہوتی جارہی ہے اور یہ بتایا جائے کہ اس حکمراں نے قلیل عرصۂ حیات میں کس عزم و حوصلہ کے ساتھ حکومت کی اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کو اپنی فکری و عملی لیاقت سے متاثر کیا۔

اسی مقصد کے تحت رحمانی فاؤنڈیشن نے ۲ دسمبر ۲۰۱۸ کو شیر شاہ سوری پر ایک قومی سیمینار کیا تھا۔ یہ اسی سیمینار کے لیے لکھے گئے اردو، ہندی اور انگریزی مقالات کا نہایت قیمتی سہ لسانی مجموعہ ہے۔ فرید خاں کے شیر شاہ بننے کی کہانی، شیر شاہ کا انتظام سلطنت، ہندوستان کی تعمیر میں شیر شاہ سوری کا حصہ، شیر شاہ سوری بہ حیثیت ماہر ماحولیات، شیر شاہ کا باطنی حسن، شیر شاہ کا نظریہ اتحاد اور عدل

و انصاف، شیر شاہ سوری نے ہندوستان کو ماڈل دیا، شیر شاہ سوری: حیات کا گوشوارہ اپنے موضوع پر مفصل معلومات و مواد فراہم کرتے ہیں لیکن چند ایک کو چھوڑ کر ان مقالات میں شیر شاہ کے عہد حکومت کے تجزیاتی مطالعے اور معنویت کے معروضی جائزے کا لطف نہیں ملا۔

شیر شاہ سوری پر منظوم خراج عقیدت میں ص ۲۰۸ پر یہ شعر نظر پڑا:

مشیت ایزدی تھی وہ تھا مئی ۱۵۴۵ء　　　قضا لے کر چلی اس کو کٹا دنیا سے سب رشتہ

پہلے مصرعہ میں عروض کا کون سا اصول پیش نظر رکھا گیا ہے پتہ نہیں چلتا۔ پروفیسر آئی، ایچ صدیقی، ڈاکٹر حسین خان، ڈاکٹر سید رضا اور نذرانہ خاتون کے مقالات انگریزی اور ۱۵ مقالات ہندی میں ہیں۔ ابتدائی تین مقالوں کو چھوڑ کر بیشتر مقالات حوالہ جات کے اہتمام سے خالی ہیں۔ بعض ایک ہی موضوع اور عنوان سے شامل کیے گئے ہیں۔ ایک مقالہ کا عنوان فہرست میں ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں شیر شاہ سوری کا کردار ہے لیکن اندر ص ۱۰۹ پر شیر شاہ سوری: ایک عظیم شخصیت چھپا ہے۔ اسی طرح اسی عنوان سے ایک اور مقالہ ہے لیکن اندر ص ۱۹۸ پر اس کا عنوان ملک کی ترقی میں شیر شاہ کی خدمات لکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ شیر شاہ سے متعلق بعض اہم، قدیم و جدید مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جن پر وضاحتی نوٹ چاہئے تھا۔ کالکار نجن قانون گو کا مقالہ آخری مہم اور انتقال: بندیل فتح کرنے کا شیر کا منصوبہ بھی شامل کتاب ہے۔ دارالمصنفین کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے کالکار نجن کی کتاب کے کچھ طویل اقتباسات کی ایک تلخیص معارف اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ میں دو قسطوں میں ''شیر شاہ کی سیکولر حکومت'' کے عنوان سے شائع کی تھی۔ یہ تلخیص اس وقت کی گئی تھی جب اس کتاب کا اردو ترجمہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اس قیمتی تحریر کو شامل کرنے سے مجموعہ کی افادیت بڑھ جاتی۔ بہر حال یہ مجموعہ شیر شاہ سوری پر قیمتی مواد و معلومات کا حامل، کارآمد اور ہندی اور انگریزی سے آشنا افراد کے لیے مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

**الخطب الدینیہ المنبریہ**: محمد فرمان ندوی۔ جمع و ترتیب، عبدالحنان ندوی، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۱۸، ملنے کا پتہ: شباب ایجوکیشنل بک ہاؤس، شباب مارکیٹ، ٹیگور مارگ، نواب روڈ، لکھنؤ۔ قیمت: ۱۶۰ روپے۔ طبع ثانی: ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۱۹۸۶۲۱۶۷۱۔ ای میل: maktabeshabab@gmail.com

منبر و محراب سے خطبات کا اہتمام ایک قدیم اسلامی روایت ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی کہی جا سکتی ہے۔ کتاب کے مصنف ندوۃ العلما میں تفسیر و ادب کے استاذ اور البعث الاسلامی کے مدیر

التحریر ہیں۔تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف اور ترجمہ کی اچھی قابلیت رکھتے ہیں۔اب تک ان کی تین درجن کے قریب تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔مولانا سعید الرحمن الاعظمی کے خصوصی تربیت یافتہ ہیں۔ایک عرصہ سے اپنے استاد گرامی کی جگہ خطبہ جمعہ کے فرائض زیادہ تر وہی انجام دیتے ہیں۔کتاب میں ۵۰ سے زائد عربی خطبات ہیں۔یہ مجموعہ پہلی بار ۲۰۱۶ میں شائع ہوا تھا۔

جمعہ کا دن ہفتہ کی عید، توحید۔دین کی اساس، قرآن۔کتاب ہدایت، قرآن۔اللہ کی مضبوط رسی، بعثت نبوی کے اغراض و مقاصد، علم دین کی فضیلت، توبہ کی حقیقت، مسلم معاشرہ کا اہم ستون۔امانت، مسجد اقصی کا قضیہ۔اسلام کا قضیہ، قرآن میں تکرار کی حکمت واہمیت، حسد۔ہر برائی کا مجموعہ، اسلام میں وسیلہ کی حقیقت، اسلام میں شوریٰ کی اہمیت، روز قیامت، موت آنی ہے، قبر اور اس کے احوال، اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے، واقعۂ اسرا و معراج، سورہ حجرات کی روشنی میں فرد و معاشرہ کی اصلاح، دعا۔مؤمن کا ہتھیار، استقبال رمضان، آنحضور ﷺ کا اہتمام رمضان، سلف صالحین کا استقبال رمضان، زکوۃ کی فرضیت، حضرت ابراہیمؑ اور صحابہ کرام کی قربانی وغیرہ جیسے موضوعات کا انتخاب واہتمام یہ بتاتا ہے کہ خطبۂ جمعہ کو موجودہ روایتی انداز سے ہٹ کر اس کو بامقصد و مفید بنانے اور حالات حاضرہ سے ان کو منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان خطبوں میں وارد روایات واحادیث کے حوالہ جات سے اس میں تصنیفی و تحقیقی رنگ آگیا ہے۔یہ خطبات اس لائق ہیں کہ ان سے دوسرے خطیب حضرات فائدہ اٹھائیں۔

**مشاہیر کے خطوط ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن کے نام:** ترتیب و تقدیم، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، کاغذ و طباعت عمدہ غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔صفحات: ۲۰۸۔ملنے کا پتہ: مرکز تحقیقات اسلامی، گلشن عتیق، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ، بہار۔قیمت: ۳۵۰ روپے۔سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۰۹۷۰۸۰۱۱۵۳۴۔ای میل درج نہیں۔

مرتب مشہور اہل قلم اور صاحب نظر عالم دین ہیں۔اس کتاب میں ان کے نام کل ۳۵ مشاہیر اہل علم کے ۱۰۰ سے زائد وہ خطوط ہیں جو انہیں ایام طالب علمی یا اس کے بعد مختلف مسائل میں استفسار کے نتیجہ میں جواباً ارسال کیے گئے تھے۔مرتب نے قارئین کی سہولت کے پیش نظر ان مکاتیب کو بزرگوں، اساتذہ اور احباب میں منقسم کیا ہے۔بزرگان دین کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا عبدالسلام قدوائی، شورش کاشمیری، مولانا امتیاز علی خان عرشی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ضیاءالدین اصلاحی

وغیرہ،اساتذہ کرام میں مولانا محمد ایوب اعظمی،مولانا سعید الرحمن اعظمی،پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر حامد علی،مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور محبان میں مولانا شمس تبریز خاں،پروفیسر احسن الظفر،مولانا محمد اجمل اصلاحی،پروفیسر ضیاء الحسن ندوی اور پروفیسر محسن عثمانی ندوی وغیرہ کے خطوط شامل کیے ہیں۔مشاہیر کے بعض خطوط کے عکس بھی ہیں۔بعض خطوط میں ایسی اہم علمی اور فقہی معلومات ملتی ہیں جو بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملیں گی۔

خاص بات یہ ہے کہ ہر خط سے پہلے مکتوب الیہ نے مکتوب نگاروں کے مختصر تعارف اوران سے ذاتی تعلقات کی نوعیت تحریر کی ہے اور حاشیہ میں خطوط کے پس منظر اور ان کے مضمرات کی نشاندہی بھی کی ہے۔اس سے یہ مزید قابل قدر اور افادیت بخش ہو گیا ہے۔ان خطوط سے مکتوب الیہ کے حصول معلومات،شوق طلب علم، تحقیق سے دلچسپی اور ملک کے کونے کونے سے مشاہیر اہل علم سے علمی روابط اور مکتوب نگاروں کے یک سطری خطوط کو بھی محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں ان کے کمال احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے۔مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا وحید الدین خان وغیرہ کے بعض خطوط ایک ایک دو دو سطری ہیں۔(ص ۹۴،۹،۷۷،۸۰۷)اس پورے ذخیرہ میں شاید ہی کوئی خط ایسا ہو جس سے کسی علمی، تحقیقی اور ادبی مسئلہ پر روشنی نہ پڑتی ہو۔دستی خطوط کی اہمیت کے سلسلہ میں مرتب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ”اس کی اہمیت اور قدر و قیمت نہ آج کم ہو سکتی ہے اور نہ مستقبل میں کم ہو گی۔“(ص ۷) ک ص اصلاحی

# ادبیات

## غزل


**زاہد جعفری**

جعفری باغ-جلالپور-فیض آباد-یوپی-۲۲۴۱۴۹-موبائل:۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸


## مرتبۂ نعت

تاریک بہت شام ہے اور دور سحر بھی !
اے ماہِ عرب! ایک نظر کر لے ادھر بھی!

الغوث ! مری کشتئ غربت کے کھوّیا!
ساحل ہے بہت پیچھے اور آگے ہے بھنور بھی!

اے یادِ نبی ! محسنِ مَن ! لے کے مجھے چل!
جز اشکِ ندامت نہیں کچھ زادِ سفر بھی!

اے موت! کجا ہست؟ بیا! وقت مدد است
اب ہجر میں دشوار ہے سانسوں کی ڈگر بھی!

تیئس برس آپ کو جب دیکھا تو جانا
ہو سکتا ہے کوزے میں سمندر کا گزر بھی!

مَہ آدھا اِدھر آدھا اُدھر بیچ میں ہے دین
الحجاز "مدینہ"[1] ہے میرے پیشِ نظر بھی!

وہ جا کے پلٹ آئے گا۔ یہ دے گا گواہی
ہیں تابع احکام نبی شمس و قمر بھی!

یوں جان لو ! اصحاب پیمبر کی فضیلت
پھول اچھے اگر ہیں تو حسین ہوں گے ثمر بھی!

ایمان پہ جیتا ہے تو ایمان پہ مر بھی !
تب ہوگا بہتّر کی طرح مر کے اَمر بھی!

سیرت کے گہر پنہاں ہیں قرآں کے صَدف میں
گہرائی میں آیت کی مگر پہلے اُتر بھی!

اعجاز ہے آیات و احادیث نبی کا
ممکن نہیں تبدیلئ یک زیر و زبر بھی!

سرکار کے بل بوتے پہ میں تن کے کھڑا ہوں
جھکنے ہی نہیں دیتے کہیں وہ مرا سر بھی!

خودداری، خودی، بیخودی، درویشی، نظر، ظرف
اے تاجور تاجوراں ! کچھ تو اِدھر بھی!

کیا مرتبہ نعتِ پیمبر کہوں زاہد!
یہ میری عبادت بھی شرف بھی ہے، ہنر بھی!

---

[1] م+دین+ہ = مدینہ

# غزل

## وارث ریاضی

مغربی چمپارن۔ بہار۔ موبائل:۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

(اسی غزل کی زمین میں حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کی ایک غزل سے متاثر ہو کر)

وفورِ بے خودی میں، میں نے چھوڑا ہے گلستاں کو
سلیقے سے مگر آباد رکھا ہے بیاباں کو

الجھتا ہوں کبھی بے تابیوں میں آستینوں سے
جنوں میں چاک کرتا ہوں کبھی جیب و گریباں کو

چمن میں کس کی آمد ہے کہ کلیاں مسکرا اٹھیں؟
یہ کس نے بخش دیں رعنائیاں گل ہائے خنداں کو

ترے رخسار کو بخشی مری نظروں نے زیبائی
سنوارا ہے جنونِ شوق نے زلفِ پریشاں کو

غرورِ حسن میں اچھا نہیں حد سے گزر جانا
بجھا دے گی کبھی غم کی ہوا شمعِ شبستاں کو

دلِ مضطر کو ملتا ہے سکوں اس کی فضاؤں میں
خدا رکھے سلامت، دیر تک صحنِ گلستاں کو

بہت ڈھونڈا، کہیں ملتا نہیں ہے آشنا کوئی
سناؤں میں کسے دنیا میں احوالِ دل و جاں کو؟

رہوں گا میں حرم والوں کا ممنوں عمر بھر یارب!
کہ وہ دینے لگے ہیں داد میرے ذوقِ عصیاں کو

محبت کے لیے اس نے بنائی ہے حسیں دنیا
اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے نوعِ انساں کو

بہت دشواریاں جھیلیں، اٹھائے رنج و غم اکثر
مگر پھر بھی نہیں بیچا متاعِ دین و ایماں کو

رہِ رشد و ہدایت پر نہیں چلتے مگر وارث
مصیبت میں وہ سینے سے لگا لیتے ہیں قرآں کو

# معارف کی ڈاک

## ادبیاتی مقالات!

اس دفعہ یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ پورے کا پورے معارف ادبیاتی مقالوں سے مزین ہے۔ معلوم نہیں یہ تبدیلی قصداً تھی یا دینی مضامین کی کمی کے باعث ہوا، لیکن خشک دینی اور کلامی مضامین کی جگہ تروتازہ ادبی مقالات کی وجہ سے اس دفعہ سارا معارف پڑھ لیا۔

عارف نوشاہی
naushahiarif@gmail.com

## غلطی ہائے مضامین

نئے سال کا پہلا شمارہ یعنی جنوری ۲۰۲۳ء ملا۔ معارف دارالمصنفین کا آرگن ہے، جس کا ہمیشہ ایک معیار رہا ہے۔ چوں کہ ایک زمانہ سے میں بھی اس سے وابستہ رہا ہوں اس لئے ذرا سی بھی چیز آنکھوں کو بہت کھٹکتی ہے۔ چند گزارشات لے کر حاضر ہوا ہوں:

(۱) سر مقالہ کے پہلے ہی صفحہ ۵ پر شاہ عبدالقادر کی پیدائش کا سن ۱۱۶۷ھ دیا ہے اور اس کے آگے اسی صفحہ پر دیا گیا ہے کہ والد کی وفات (۱۱۳۱ھ) کے وقت صرف نَو سال کے تھے ظاہر سی بات ہے والد (شاہ ولی اللہ) کا سن وفات غلط ہے۔

(۲) صفحہ ۱۴ پر عبارت ہے کہ ''موضح قرآن کا سب سے قدیم قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، یہ نسخہ ۱۲۳۴ھ یعنی ۱۸۰۹ء میں لکھا گیا''۔ جب کہ اسی صفحہ پر نیچے ''رضا لائبریری رامپور میں اس کا چھپا پہلا نسخہ ۱۲۳۰ھ یعنی ۱۸۰۸ء کا ہے۔'' کیا دونوں باتیں و سنین صحیح ہیں؟

(۳) صفحہ ۱۶ پر خانوادۂ حضرت شاہ مراد آتوری (متوفی ۱۱۵۵ھ) کے چشم وچراغ حضرت علامہ حافظ شیخ عبدالقادر آتوری (متوفی ۱۱۵۵ھ تقریباً) دیا گیا ہے۔ کیا دونوں حضرات کا انتقال ایک ہی سن میں ہوا؟

(۴) صفحہ ۳۵ پر پہلی ہی سطر میں ملا الدین اردبیلی نام ہے، کیا یہ نام صحیح ہے یا نزھۃ الخواطر کے لحاظ سے صفی الدین اردبیلی ہے؟

(۵) صفحہ ۳۷ پر پہلی ہی سطر میں ''حافظ قرآن کے لیے انعام شیرینی اور مفت بعام تقسیم''

لکھا ہے۔ یہ بعام کیا ہے؟ کہیں یہ بعام تو نہیں؟[1]

(۶) یوسف القرضاوی صاحب پر بہت اچھا اور تفصیلی مضمون رقم کیا گیا ہے مگر دارالمصنفین کے اسلام اور مستشرقین سیمینار میں ان کی آمد اور ۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کے افتتاحی جلسے میں ان کی تقریر اور آخری دن ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کی آخری تقریر کا ذکر نہیں آیا ہے، جب کہ ہندوستان کی آمد کا ذکر صفحہ ۶۶ پر آیا ہے۔

**شاہ ظفر الیقین**

گیان پور۔ بھدوہی

۸۸۵۸۶۸۰۴۰۹

## جناب وارث ریاضی صاحب کے نام

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ میں حلفیہ عرض کرتا ہوں کہ میرا وطیرہ دل آزاری نہیں، دل آرائی ہے۔ معارف ایک عارفانہ خزانہ ہے۔ برسوں برس سے فردوس مکانی حضرت علامہ شبلی نعمانی کے بے تعصب وارثان مدیران معارف علم و ملت کے نہایت مخلص اسلامی نمائندے رہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن جیسے باغبانوں نے اس گلشن میں خزاں نہیں آنے دی۔ اگر معمولی سے معمولی ذرہ بھی اس تجلی زار کے کسی گوشے میں جگہ پا جائے تو وہ النجم الثاقب ہو جاتا ہے۔ معارف کے شذرات و مشمولات اپنی تجلیات سے ذہن و دل کو دیار طور بنا دیتے ہیں۔ اب ڈاکٹر ظفرالاسلام اور محمد عمیر الصدیق جیسے دانشور اس کہکشاں پر ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' کی ادبی اذان دیتے ہوئے قلم کو علم بناتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے تو ان کے رو برو جاتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے مگر نجانے کیوں کبھی کبھی جذبۂ دل اتنا بے چین کر دیتا ہے کہ۔ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔

حضرت وارث ریاضی صاحب قبلہ! یہ خاکسار براہ راست آپ جیسے اہل نظر اور صاحب نظریہ سے مخاطب ہے:

---

[1] ''بعام'' در حقیقت ''طعام'' ہے۔ لیکن یہ نوری نستعلیق سافٹ ویر کی خرابی ہے کہ وہ چند الفاظ کو از خود بدل دیتا ہے جس میں یہ لفظ بھی شامل ہے۔ ابھی تک اس کا علاج ممکن نہیں ہو پایا ہے۔ جو ایسا لفظ ہمارے پروف ریڈروں کو نظر آ جاتا ہے، وہ اسے کسی اور فونٹ میں بدل دیتے ہیں (مدیر)

اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے!

یہ مکتوب نگار نہ ادیب نہ شاعر نہ عالم نہ فاضل نہ صاحب قلم نہ محقق نہ مؤرخ نہ مبصر نہ مفسّر نہ حافظ نہ قاری، نہ مفتی، بس گلستان علم وادب اور چمنستان صداقت و حدیقۂ حقیقت کا ایک آشفتہ مزاج کوتاہ بین خوشہ چیں ہے۔ سچائیوں کی خوشبو کو تلاش کرنے کا جذبہ بے اختیار کتابوں کے گلزار میں کھینچ لے جاتا ہے اور جو کچھ بھی بصارت و بصیرت کو میسر آتا ہے اسی کی پر کیف و حوصلہ مند مستی میں شرابور ہو جاتا ہے۔

ماہ دسمبر ۲۰۲۲ عیسوی کے شمارے میں اپنے مکتوب کے جواب میں آپ کے ارشادات دیکھے۔ محترم نے میرے خط کو ژولیدگی بیان کا نمونہ بتایا۔ میرا بیان آپ کو محلِّ نظر آیا۔ خط کو مخاصمتی لٹریچر کے زمرے میں رکھ دیا۔ میرے شعر کو مہمل ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ شاعری بغیر جدلیاتی نظام کے مزخرفات ہو جاتی ہے: یارب! دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور۔ آپ کو اپنا مقطع تو یاد ہو گا:

نہیں ہے فرصت کسی کو، دیکھے کہ کون کس لباس میں ہے
کہ ہر بشر اس جہاں میں وارث! خود اپنی دُھن میں مگن ملا ہے

آپ کے مخاصمتی و تیکھے لب ولہجے نے میری عقیدت کو گرفت میں لے لیا ہے۔ ذرا اپنے لفظوں کی نشتریت ایک بار پھر دیکھ لیجئے:

> مکتوب سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ (یعنی میں زاہد جعفری) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو معیار حق یا برسر حق سمجھتے ہیں یا وہ بھی صحابہ کرام کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے (آخری جملہ) کیا ان دونوں (زید بن ارقم و براء بن عازب) کی روایتوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو افضلِ صحابہ ہونے کا تاثّر دینا چاہتے ہیں۔

آپ کے خط میں دو ترکیبیں (کرم اللہ وجہہ اور رضوان اللہ علیہم) خود دلیل مراتب ہیں: کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام فبای آلآء ربکما تکذبان (سورۃ الرحمن آیت نمبر ۲۷ تا ۲۸) (۱) اکرام بہ معنی تعظیم و تکریم۔ اکرم بہ معنی کریم صیغۂ تفضیل ہے۔ وجہہ بہ فتح اوّل و سکون دوم و سوم سبب، باعث، چہرہ، دلیل، جانب، طور طریقہ۔ وجہ کی صفت وجیہ بہ معنی خوبصورت، زیبا، صاحب جاہ، خوش وضع، (۲) رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اوٰلئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ہم المفلحون (سورۃ الحشر آیت نمبر ۲۲) حزب اللہ کے لیے ہے۔ حزب الشیاطین ہم الخاسرون ہیں۔

قبلہ وارث صاحب! آپ نے اپنے خط کے آخری جملے میں جو اشارہ دیا ہے وہ میں نے علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی جلد دوم کے صفحہ ۲۵ سے لیا ہے جو علامہ نے صحیح مسلم، مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی اور طبری کے حوالے سے لکھا ہے۔ پیغمبر آخرالزماں نے اپنے آخری خطبے میں ۸ ذی الحجہ کو فرمایا تھا: انا تارک فیکم الثقلین ،اولہما کتاب اللہ فیہ الہدی والنور فخذوا کتاب اللہ و استمسکوا بہ، واہل بیتی ، اذکرکم اللہ فی اہل بیتی۔ یہ اہل بیت کون ہیں؟ قرآن مجید نے بتایا: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت ویطھرکم تطہیرا (الاحزاب آیت نمبر ۳۳)۔ یہ اہل بیت منجملہ علی پانچ ہستیاں ہیں! حدیث رسول ﷺ میں ہے (انا مدینۃ العلم و علی بابھا)۔ امام شافعی نے کہا (علی حبہٗ جنۃٌ۔ امام الناس والجنۃ ۔ وصی مصطفی حقا قسیم النار والجنۃ)۔ حسان بن ثابت کا شعر: (فقال لہ یا علی فانی رضیتک من بعدی اماما وھادیا)۔ شاہ علی حسن جائسی اہل اللہ (عبث من کنت مولا میروی ہر سو۔ علی مولا بہ ایں معنی کہ پیغمبر بود مولی)۔ مرزا غالب (غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں)۔ کائنات میں آدم سے خاتم تک، توریت سے قرآن تک بعد از نبی کیا اتنی عظیم اور بے داغ ہستی اور کوئی ہے؟ میں کیا اور میری حیثیت ہی کیا جو افضلِ صحابہ ہونے کا تاثر دے سکوں؟ ہے تو ہے! رہ گئی فضیلت کی دلیل؟ تو یہ تو رسولوں کی فہرست میں بھی موجود ہے تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۵۳)۔ مجھے تو اعتراف و اظہار میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی!

کرم اللہ وجہہ - قرآن کی قسم - الٰہی خطاب ہے۔ اور ایسا کہ کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اب میں اپنے عقیدے کے سلسلے میں اپنے آئیڈیل حضرت شبلی نعمانی مرحوم کا ایک بیان نقل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ خط ہے جو علامہ نے اپنی رحلت (۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء بروز چہار شنبہ) کے چار ماہ پہلے سید نظیر الحسن رضوی کو بمبئی سے اس وقت لکھا تھا جب وہ سیرت النبی کی تالیف میں ہمہ تن مصروف تھے:

> یہاں (بمبئی میں) کام نہایت سکون سے ہو رہا ہے۔ ارادہ تو ہے کہ اب بغیر تکمیل کتاب یہاں سے نہ ٹلوں گا اور سنئے! جناب امیر کی عمدہ سوانح کی سخت ضرورت ہے۔ نہایت ناتمام کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں۔ عربی میں کوئی جامع تصنیف نہیں (اردو فارسی چہ؟) ان کے غزوات و محاربات کے علاوہ ان کے علمی کارنامے بہت ہیں۔ اکثر خواص میں یہ خیال بھی پھیلا ہوا ہے کہ موصوف جناب امیر یعنی علی کے اصول سیاسی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے، اس کو بھی دلیلوں سے رفع کرنا ہے۔ میں [شبلی نعمانی] حضرت عمرؓ کے بارے میں سُنّی اور حضرت امیر کے بارے میں شیعہ ہوں۔

وارث صاحب! آخری فقرہ میرا جواب ہے۔ آپ کے خط میں دو اور نشتر۔ بنام تنقید و خطائے اجتہادی۔

اور بھی ہیں۔ سنئے! تنقید اور تنقیص کا دارومدار نیّت پر ہوتا ہے، اگر رویّہ مخلصانہ ہو مخاصمانہ نہ ہو، اتہام نہ ہو، دشمنی و حسد سے دور ہو، تو تنقید تنقید ہے اور اگر تنقید برتنے میں کوئی اور جذبہ شامل ہو جائے تو وہ تنقیص اور عَیب جوئی ہے کیوں کہ مخاصمت کا بیج بُغض کی زمین سے اگتا ہے۔ اور بُغض کا انجام تو خود کردار کو داغدار بنا کر آدمی کو قعرِ مذلت میں گرا دیتا ہے۔ کانٹے بچھانے والے کی انگلیوں میں کانٹا خود چبھ جاتا ہے۔ اور تنقید تو خود بڑی بڑی ہستیوں نے بڑی بڑی ذاتوں پر کی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ نے ابوہریرہ پر تنقیدیں کی ہیں اور تو اور تنقید کا جذبہ تو انسانوں ہی نہیں فرشتوں میں بھی پایا گیا۔

وَاذْ قال ربک للملٰئکَۃِ إنی جاعِلٌ فی الارض خلیفۃ ... قالوآ اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ (البقرہ آیت نمبر ۳۰)۔ ابلیس نے انانیت میں تنقیص کی: اَبیٰ وَاستکبر وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ (۳۴)۔

اسلامی تاریخ میں ایسے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل لرزنے لگتا ہے۔ محبوبِ ربّانی کے صحابہ کرام کا رتبہ اللہ اکبر! کسی انسان کے بس میں نہیں کہ متعین کر سکے! وہ نہ ہوتے تو پیغامِ رسول کا کیا ہوتا؟ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۵....اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ .........اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْراً عَظِیْمًا کی دس شرطوں پر سوائے صحابہ اور کون اترا؟ کن کے لیے کائنات کے رہبر اعظم نے فرمایا: اِنّ اصحابی کا لنجوم با بھم اقتدیتم اھتدیتم.....کلما غاب نجم الطلع الی یوم القیامہ......ہاں ایک بات یہ ضرور ہے کہ آقائے نامدار کو دیکھ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ دیکھا تو ابولہب اور ابوجہل نے بھی مگر ان لوگوں نے آقائے رحمۃ للعالمین کو دلی اذیّتیں دینے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تو خدا نے بھی اپنا فیصلہ بتا دیا: تبّت یدآ ابی لہب وتبَّ (پہلی آیت) وَامرَاَتُہٗ حَمَّا لَۃَ الْحَطَبِ (چوتھی آیت) فِیْ جیدِھا حبل منّ مَسَد (پانچویں آیت۔ ۱۱۱ویں سورہ)۔ حرکتِ بے جا ہو جائے تو اللہ جل جلالہٗ کسی کو نہیں چھوڑتا۔ یانِسآء النبی مَنْ یّات مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُبَیّنَۃٍ یُّضَاعَفْ لَھَا الْعَذَابَ ضِعْفَیْن وَکَانَ ذَالِکَ عَلیَ اللّٰہِ یَسِیْراً (الاحزاب آیت نمبر ۳۰)۔ صرف زبان سے کلمہ پڑھ لینا سند نہیں ہے ۔الا یمان هو الاقرار ....باللسان والعقد.... بالجنانِ والعمل بالا رکان.....ورنہ...... والعصران الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملواا لصالحات وتواصوا بالحقّ وتواصوا بالصبر (سورہ نمبر ۱۰۳)

اب آخری بات۔ خطائے اجتہادی کا تعلق مجتہدین اور فقہاء سے ہے۔ اسلام میں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ جب قرآن اور خدا کا رسول ﷺ کسی چیز کا کوئی فیصلہ کر دے تو چوں وچرا کرے۔ ورنہ بڑے تلخ و دلخراش تاریخی واقعات ہیں۔ جو ہو گئے وہ نہیں ہونا چاہیے تھا، مثلاً رسول کی صلح حدیبیہ میں شک

نہیں کرنا چاہیے تھا۔ رسول نے ایتونی بد واۃ وبیاض لازیل عنکم اشکال الامر فرمادیا تھا تو: ان الرجل لیہجر حسبنا کتاب اللہ کہہ کے انہیں دکھانا چاہیے تھا (سیرۃ النبی جلد دوم) اقتلوا نعثلاً کے نتیجے میں عثمان غنی کا قتل۔ جنگ جمل، جنگ صفین، عمار یاسر اور اویس قرنی کی شہادت، ابوذر کی جلاوطنی، مالک بن نویرہ کا قتل پھر ان کی بیوہ پر تصرّفِ جبری، ابن ملجم کے ذریعے چوتھے خلیفہ کا مسجد کوفہ میں زخمی کرنا، حسن مجتبیٰ کو جعدہ بنت اشعث سے زہر دلوانا، ام المومنین عائشہ کو امیر معاویہ کا زندہ در گور کردینا (سیوطی ترمذی کامل ابن اثیر)، کربلا میں نواسۂ رسول امام حسین کی سن ۶۱ ہجری میں شہادت، اہل حرم کو اسیر کرنا وغیرہ وغیرہ کو خطائے اجتہادی مان لینا خود بہت بڑی خطا ہے۔ خطا کسی سے بھی سزا کا سزاوار ہے۔ ارے جب ترک اولیٰ انبیاء کو مل گئی تو گنجائش کہاں رہ گئی؟ آدم کو عالمِ عَلوی سے عالم سفلی میں اترنا پڑا۔ خدا نے کہا تھا: وَلَا تَقْرَبُوا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (آیت ۳۵) مگر....فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا (البقرہ ۳۶)۔ اس ترک اولی کو خدا نے من الظالمین کے زمرے میں بتادیا۔ استغفر اللہ! ۔ رہ گیا ''رضی اللہ'' تو یہ تو دعا ہے، دعا کی جاتی ہے۔

**زاہد جعفری**

جعفری باغ، جلال پور، فیض آباد ۲۲۴۱۴۹

۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸

# رسید کتب موصولہ

**ابواب زندگی:** حافظ ضیاء الدین محمد، مترجم محمد ناصر سعید اکرمی، مکتبہ ملت دیوبند یوپی، صفحات ۳۶۰۔ سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۰۲۱۰۵۳۰۰

**اکثر یاد آتے ہیں:** مولانا عبدالعلی فاروقی، مکتبہ البدر کاکوری لکھنؤ، صفحات ۲۰۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰روپے۔ موبائل نمبر: ۹۴۵۰۱۱۰۴۶۳

**تجوید الفرقان مع علم النغمات:** مولوی محمد حسیب فرقانی، دفتر جامع مسجد رامپور، (اترپردیش) صفحات ۵۲، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۵۰روپے۔ E-mail: furqania1950@gmail.com

**تذکرہ حضرت مولانا محمد شہباز اصلاحی:** محمد ناصر سعید اکرمی، مکتبہ الشباب العلمیہ لکھنؤ۔ صفحات ۶۲۴، سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۵۰۰روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۰۲۱۰۵۳۰۰

**خطیب اعظم حیات اور خدمات:** ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی، دفتر ضیاءِ وجیہہ، مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ بازار، مسٹن گنج، رامپور۔ صفحات ۶۹۶۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۰۰۰ روپے۔ موبائل نمبر: ۹۴۱۲۳۶۴۱۱۱

**رسالۂ خواطریہ:** میر سید علی ہمدانی، مترجم مولانا محمد سعید مسعودی، شبیر احمد مسعودی، ایڈووکیٹ جموں اینڈ کشمیر ہائی کورٹ دودرہامہ گاندربل کشمیر، صفحات ۶۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت درج نہیں

**زبان کی آفتیں:** سعید بن علی، مترجم محمد ناصر سعید اکرمی، معہد الامام حسن البنا، بھٹکل (کرناٹک) صفحات ۱۲۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۵۰روپے۔ موبائل نمبر: ۹۹۰۲۱۰۵۳۰۰

**مضامین عرفان:** محمد عرفان جونپوری، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، صفحات ۲۴۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۲۵۰روپے۔ موبائل نمبر: ۹۰۴۴۴۲۴۲۰۸

**مئو شہر ہنرواراں:** ڈاکٹر شکیل احمد، مکتبہ نعیمیہ، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن (یوپی) صفحات ۳۲۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۴۰۰روپے۔ موبائل نمبر: ۹۲۳۶۷۲۲۵۷۰

**نگار خانہ کولکاتا:** (ادبی مضامین) ڈاکٹر امام اعظم، ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔ صفحات ۲۰۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۱۵۰روپے۔ E-mail: info@ephbooks.com

# تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

| | | | |
|---|---|---|---|
| سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن) | 2000/- | موازنہ انیس ودبیر | 250/- |
| سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ے جلدیں) | 2800/- | اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر | 100/- |
| مقدمہ سیرۃ النبیؐ | 30/- | سفر نامہ روم ومصر وشام | 200/- |
| الفاروق | 350/- | کلیات شبلی (اردو) | 220/- |
| الغزالی | 300/- | کلیات فارسی (فارسی) | -- |
| المامون | 175/- | مقالات شبلی اول (مذہبی) | 170/- |
| سیرۃ النعمان | 400/- | مقالات شبلی دوم (ادبی) | 70/- |
| سوانح مولانا روم | 220/- | مقالات شبلی سوم (تعلیمی) | 170/- |
| شعر العجم (اول) | 250/- | مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) | 200/- |
| شعر العجم (دوم) | 150/- | مقالات شبلی پنجم (سوانحی) | 150/- |
| شعر العجم (سوم) | 125/- | مقالات شبلی ششم (تاریخی) | 150/- |
| شعر العجم (چہارم) | 200/- | مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) | 100/- |
| شعر العجم (پنجم) | 150/- | مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) | 150/- |
| مکاتیب شبلی (اول) | 150/- | الندوہ (۹ جلدیں) | 4735/- |
| مکاتیب شبلی (دوم) | 190/- | اسلام اور مستشرقین (چہارم) | 250/- |
| الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | 350/- | الکلام | 250/- |
| | | علم الکلام | 200/- |
| خطبات شبلی | 150/- | انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی) | 200/- |

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print MAR 2023 Vol. 210/03

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

*Monthly Journal of*

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

## دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| سیرت عمر بن عبدالعزیز | مولانا عبدالسلام ندویؒ | 100/- |
| مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں | پروفیسر اشتیاق احمد ظلی | 250/- |
| مطالعات شبلی | ,, ,, | 550/- |
| حیات سعدی | خواجہ الطاف حسین حالی | 400/- |
| شبلی شناسی کے اولین نقوش | پروفیسر ظفر احمد صدیقی | 600/- |
| شبلی کی آپ بیتی | مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم | 325/- |
| امام رازی | مولانا عبدالسلام ندویؒ | 320/- |
| حیات سلیمان | شاہ معین الدین احمد ندویؒ | 600/- |
| تذکرۃ المحدثین (اول) | مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ | 200/- |
| تذکرۃ المحدثین (دوم) | ,, ,, | 225/- |
| تذکرۃ المحدثین (سوم) | ,, ,, | 300/- |
| محمد علی کی یاد میں | سید صباح الدین عبدالرحمنؒ | 120/- |
| مولانا ابوالکلام آزاد | مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ | 240/- |
| ابن رشد | محمد یونس فرنگی محلیؒ | 330/- |
| تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد) | شاہ معین الدین احمد ندویؒ | 375/- |
| تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد) | ,, ,, | 500/- |
| تاریخ صقلیہ اول | سید ریاست علی ندویؒ | 400/- |
| تاریخ صقلیہ دوم | ,, ,, | 400/- |
| اسلام میں مذہبی رواداری | سید صباح الدین عبدالرحمن | 250/- |
| یہود اور قرآن | مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ | 150/- |
| تاریخ ارض القرآن | مولانا سید سلیمان ندویؒ | 375/- |